آزادی سے قبل اردو تحقیق

ڈاکٹر محمد اکمل

آزادی سے قبل اردو تحقیق

آزادی سے قبل اردو تحقیق

ڈاکٹر محمد اکمل

کتاب : آزادی سے قبل اردو تحقیق
مصنف : ڈاکٹر محمد اکمل
تعداد : ۵۰۰
مطبع : ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔
زیراہتمام : ایم۔آر۔پبلی کیشنز
10 میٹرو پول مارکیٹ، 25-2724 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

Azadi Se Qabl Urdu Tahqeeq

by

Dr. Mohd. Akmal

I-38, 2nd Floor, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025
Cell: 09868741941 E-mail:akmalshadab@gmail.com

ISBN: 978-93-80934-95-2

Edition :2013

Price: ₹ 95/-

Printed & Published by

M. R. Publications

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books

 # 10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 09810784549, 09873156910

E-mail: abdus26@hotmail.com

انتساب

مشفق اساتذہ

پروفیسر عبد الحق

پروفیسر ابن کنول

پروفیسر توقیر احمد خاں

کے نام

فہرست مضامین

ابتدائیہ

پروفیسر ابن کنول
سابق صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

جس طرح تحقیق ایک دشوار گزار راہ ہے اسی طرح تحقیق پر تحقیقی گفتگو بھی خاردار راستوں سے گزرنے کے مترادف ہے۔ اردو تحقیق کی روایت بہت قدیم نہیں ہے، بہت کم ادیبوں نے اس پرخار راستے کو اختیار کیا ہے اس کی وجہ کوہ کندن وکاہ برآوردن ہے۔ سرسید احمد خاں نے خود کو آزمائش میں ڈال کر اس جانب قدم بڑھایا، مولوی عبدالحق نے خاک چھانی اور اردو ادب کے دامن میں چند نایاب موتی ٹانک دیئے۔ حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور امتیاز علی خاں عرشی نے جوئے شیر کے لئے کوہ کنی کی۔ رشید حسن خاں، تنویر احمد علوی اور ان کے ہم عصر بعض دیگر محققین نے آبلہ پائی کی اور اردو کے لئے باغِ ارم کے دروازے وا کئے۔ غرضیکہ گزشتہ ایک صدی میں مذکورہ افراد کے علاوہ چند ہی اور نام ایسے زبان پر آئیں گے جنہوں نے تحقیق کے بے آب وگیاہ میدان میں قدم رکھا ہوگا۔ دراصل تحقیق ہے ہی ایسا طلسم کہ ذرا سی لغزش سے ساری محنت ضائع ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں لازم ہے کہ ہم ان محققین کی خدمات کا اعتراف کریں، جنہوں نے سمندر سے تلاش کرکے گہر ہائے بے بہا اردو ادب کو دیئے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اکمل اس لئے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اردو کے نامور محققین کی بیش بہا خدمات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر محمد اکمل اردو کے ایک سنجیدہ قاری اور ذہین ریسرچ اسکالر ہیں۔ وہ انتہائی انہماک کے ساتھ ادب کا مطالعہ کرتے ہیں اور ذمہ داری کے ساتھ اس مطالعہ سے حاصل ہونے والے نتائج کو پیش کرتے ہیں۔ زیرنظر کتاب میں انہوں نے اردو تحقیق کی تقریباً تاریخ رقم کردی ہے۔ تحقیق کی معنویت، اہمیت اور افادیت کے ساتھ ساتھ اردو کے اہم ترین محققین پر مضامین لکھ کر ڈاکٹر اکمل نے ایک ایسا کام انجام دیا ہے جس سے جامعات کے اساتذہ اور طلبہ دونوں ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کی یہ کتاب قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ میں ان کے روشن مستقبل کے لئے دعا گو ہوں۔

پیش گفتار

پروفیسر توقیر احمد خان
صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

جب میں شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں عارضی لکچرر تھا، محمد اکمل اس وقت ایم اے کے طالب علم تھے۔ وہ طلباء میں ممتاز اور ہونہار نظر آتے تھے کچھ اس لئے بھی کہ وہ کافی محنتی اور ذہین تھے اور کچھ اس لئے بھی ان کی ابتدائی درس گاہ ایک مدرسہ تھی۔ اردو ادب میں علمائے کرام کا مقام نہایت نمایاں ہے۔ علم دین کے حصول کی مشقت انگیز عادتیں انہیں ادب میں بھی محنت شاقہ کا عادی بنا دیتی ہیں چنانچہ اس صف کے حضرات جب اس لائن میں آتے ہیں تو اپنا رعب و دبدبہ قائم کر دیتے ہیں۔ محمد اکمل میں محنت اور محبت کے علاوہ تحقیق و جستجو کا مادہ بھی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر بے حد خوشی ہے کہ محمد اکمل آج ڈاکٹر محمد اکمل ہو گئے ہیں اور تحقیق جیسے اہم اور خشک موضوع پر قلم اٹھانے کی جسارت کر رہے ہیں۔ انہیں جو استاد میسر ہوئے وہ بھی بے حد محنت اور مشقت کرنے والے تھے۔ میری مراد پروفیسر عبدالحق سے ہے جن کا مزاج تحقیق و تدقیق سے زیادہ میل کھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نگرانی میں کام کرنے والے طالب علموں کو بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ محمد اکمل نے

تحقیق کے موضوع پر یہ کتاب 'آزادی سے قبل اردو تحقیق' لکھی، اس کی تکمیل میں پروفیسر عبدالحق صاحب کے مشورے شامل رہے ہیں۔ ہر چند یہ کتاب ایک ابتدائی شکل ہے اور اس میں جن محققین کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے وہ اپنے آپ میں نہایت اہم ہیں۔ ڈاکٹر اکمل کے مطالعہ کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ انہوں نے تحقیقی اصول وضوابط کو پیش نظر رکھ کر تحقیقی کاموں کا مطالعہ کیا ہے اور اس اعتبار سے اس مطالعہ میں کسر وغلو کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ تحقیق کے بارے میں یوں بھی کوئی حتمی رائے نہیں دی جاسکتی۔ اس لئے ڈاکٹر محمد اکمل نے اس مطالعہ میں بڑی حد تک دامن کو بچانے کی سعی کی ہے اور کوشش کی ہے کہ تحقیقی مطالعہ معروضی ہو۔ مطالعہ جیسا بھی ہو اس کی نوعیت الگ ہے لیکن ایک بات ضرور ہے کہ اس مطالعہ نے صاحب کتاب کے اندر تحقیقی نظر ضرور پیدا کردی ہے اور تحقیق کا فن ان کے رگ وریشہ میں رچنے بسنے لگا ہے۔ اس تحقیقی مزاج کی وجہ سے مستقبل میں ان سے بہت سی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ یہ ان کی تحقیقی کاوش کا نقش اول ہے جن کی روشنی میں ایک اور بہتر اور نقش ثانی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ان کا مطالعہ وقیع اور ان کے تجربات وسیع ہیں۔ دعا گو ہوں کہ محمد اکمل کا تصنیف وتالیف کا یہ سلسلہ جاری وساری رہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر مجھے بے حد خوشی محسوس ہورہی ہے۔

ایک ابتدا تو ہوئی شوق کے فسانے کی

مقدمہ

تحقیق حقائق کو دریافت کرنے اور ان کی تصدیق کرنے کا نام ہے۔ تحقیق ایسا عمل ہے جس سے صحیح اور غلط کے درمیان فرق کیا جاسکتا ہے۔ تحقیق ادب سے متعلق ہوسکتی ہے اور سماجی علوم سے بھی وابستہ ہوتی ہے۔ تحقیق بہت ہی مشکل اور صبر آزما عمل ہے۔ تحقیق ہر آزمائش کا تقاضہ کرتی ہے اسی لئے علمی مطالعہ میں تحقیق کو بڑی معنویت حاصل ہے۔

آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کئی محقق پیدا ہوئے، اردو میں آزادی کے بعد تحقیق پر بہت سے کام ہوئے اور آج بھی اس سے متعلق مسلسل کام ہو رہے ہیں۔ آزادی سے قبل چند لوگوں نے تحقیقی خدمات انجام دی ہیں۔ واضح رہے کہ آزادی سے قبل اردو محققین کے تعلق سے کوئی ایسا کام نہیں ہوا جس پر بہت فخر کیا جاسکے اور نہ ہی کسی شخص نے ان محققین کے کارناموں کو یکجا کیا ہے۔ آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد اردو میں تنقید پر بڑی توجہ دی گئی ہے اور ناقدین نے بہت سی تنقیدی تصانیف و تالیفات چھوڑی ہیں اور یہ تصانیف ایسی ہیں جن سے تنقید کے طالب علم کی تشنگی بہت حد تک کم ہوسکتی ہے۔ تنقید اور اصول تنقید پر لکھی گئی ان کتابوں سے تشفی و تسلی ہوسکتی ہے۔ تحقیق کے لئے دلچسپی، سچی لگن اور جنون درکار ہے۔ محقق کو اپنے تحقیقی موضوع یا تحقیقی کام پر اپنا سب کچھ قربان کرنا

پڑ سکتا ہے۔ ان پریشانیوں اور دقتوں کے پیش نظر اکثر لوگوں نے تحقیق سے دوری اختیار کر کے تنقید نگاری کو ہی اپنا موضوع منتخب کیا۔ اگر آج بھی آزادی سے قبل یا آزادی کے بعد اردو تحقیق سے متعلق مواد حاصل کرنا چاہیں تو بہت ہی پریشانیوں کے بعد اتنے مواد اور اتنی جانکاری حاصل ہو سکے گی، جس سے شاید تشنگی ختم نہ ہو۔

تحقیق بہت ہی وسیع موضوع ہے۔ اس سلسلے میں کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں، پھر بھی راقم نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ تحقیق سے متعلق ضروری معلومات پیش کر دی جائیں جس سے تحقیق کے طالب علموں کی تشنگی کسی حد تک کم ہو سکے، کتاب کا عنوان ''آزادی سے قبل اردو تحقیق'' ہے۔ یہ کتاب چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ تحقیق اور اس کی اہمیت پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں تحقیق، اصول تحقیق اور تحقیق کے سلسلے میں محققین کے نظریات کے ساتھ تحقیق کی اہمیت اور اس کی افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ تحقیق کیا ہے اور وہ کون سے اصول ہیں جن کے اختیار کرنے سے معیاری تحقیق منظرِ عام پر آسکتی ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے علمِ حدیث کے بارے میں روایت و درایت کے جو اصول بنائے تھے ان پر جس قدر فخر کیا جائے کم ہے۔ انہیں مسلمانوں کے بنائے گئے اصول کو اہلِ مغرب نے تحقیق کے لئے اپنایا اور معیاری اور اعلیٰ تحقیق کے لئے آج بھی یہی اصول اختیار کیے جانے چاہئیں۔ اس کے علاوہ کتاب کے اسی حصے میں تحقیق کی غرض و غایت کے بیان کے ساتھ تحقیق کی قسموں کو واضح کیا گیا ہے، پھر تحقیق و تنقید کے باہمی رشتے بیان کر کے دورانِ تحقیق پیش آنے والے مسائل و مراحل اور ان کا حل پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں اردو میں تحقیق کی روایت کو بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کا تیسرا حصہ آزادی سے قبل اردو تحقیق کے دو ادوار پر مشتمل ہے۔ پہلے دور میں سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی کی تحقیقی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی باقاعدہ محقق نہیں تھے اور نہ ہی ان کے سامنے تحقیق کے اصول وضوابط تھے۔ پھر بھی

ان کی تحریروں اور تصانیف میں تحقیق کے نقوش پائے جارہے تھے، انہوں نے اپنی تحریروں اور تصانیف میں چھان بین اور تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔ ہاں سرسید احمد خاں باقاعدہ محقق تھے، ان کی کئی تصانیف مکمل تحقیق اور ترتیب و تدوین کے ضمن میں آتی ہیں۔ ان کی تحریروں سے تحقیق کے اصول اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ آزادی سے قبل اردو تحقیق کے دوسرے دور میں مولوی عبدالحق، حافظ محمود خاں شیرانی، سید مسعود حسن رضوی ادیب، نصیرالدین ہاشمی، مولانا غلام رسول مہر، قاضی عبدالودود، وجاہت حسین عندلیب شادانی، سید محی الدین قادری زور اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی علمی اور تحقیقی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہی وہ دور ہے جسے اردو تحقیق کا سنہرا دور کہا گیا ہے۔ ان کے سامنے تحقیق کے اصول وضوابط تھے۔ آزادی سے قبل اردو تحقیق کے دوسرے دور کے محققین نے ادب کے بیشتر موضوعات کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ ہر محقق نے اردو تحقیق نگاری میں اپنا ایک مقام بنایا۔ اپنی خدمات کی وجہ سے بت کوئی شکن محقق کہلایا تو کوئی تحقیق کا نقش اول اور کوئی نقش ثانی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے باقاعدہ تحقیقی کام کیے اور اپنی زندگی تحقیق کے نام وقف کر دی۔ ان لوگوں نے اپنی تحقیقی خدمات سے اردو تحقیق کا معیار بلند کیا ہے۔

کتاب کا چوتھا اور آخری حصہ ضمیمہ ہے۔ ضمیمے میں مقدمہ نویسی، حاشیہ نگاری، ضمیمہ رتعلیقات نویسی، فرہنگ سازی، کتابیات سازی اور اشاریہ سازی پر بالاختصار روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان متعلقات تحقیق کے بارے میں ہر تحقیق کے طالب علم کو معلومات ہونی چاہئے۔ ان کے بارے میں جاننا ہر محقق کے لئے بے حد ضروری ہے۔ اسی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان مباحث کو ضمیمے کے ذیل میں شامل کیا گیا ہے۔

تحقیق نہایت ہی خشک موضوع ہے، اس پر کام کرنے کے لئے سچی لگن اور سخت محنت کی ضرورت ہے۔ راقم نے پروفیسر عبدالحق، پروفیسر ابن کنول اور پروفیسر توقیر احمد خان جیسے مشفق اساتذہ کی ہمت و حوصلہ فزائی کی وجہ سے تحقیق جیسے خشک موضوع پر کام کرنے کی یہ جسارت کی ہے۔ انہوں نے ہر قدم پر رہنمائی کی اور تحقیق و تدوین کے اصول

سے آگاہ کراتے رہے۔ آپ لوگوں کی نصیحتوں اور ہدایتوں نے تحقیق نگاری کے علاوہ اور بہت سی دیگر چیزوں کی طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے ہر ہر قدم پر میری غلطیوں کی اصلاح کر کے مفید مشوروں سے نوازا، جس کے لئے ذاتی طور پر احسان مند ہوں۔ آپ لوگوں کی تعلیم و تربیت ہی کا نتیجہ ہے کہ یہ کام بحسن و خوبی مکمل ہوا۔ اس کتاب میں کچھ کوتاہیاں اور زبان و بیان کی لغزشیں بھی ہو سکتی ہیں۔ امید ہے کہ قارئین اس کتاب میں پائی جانے والی کوتاہیوں اور خامیوں سے صرف نظر کے بجائے اس سے واقف کرائیں گے اور قارئین ہی یہ فیصلہ کریں گے کہ یہ جسارت اور کوشش کس حد تک کامیاب ہوئی ہے۔

اس کتاب کی تکمیل میں جن کے تعاون اور مشورے شامل حال رہے ہیں ان سب کا شکر گزار ہوں۔ اس موقع پر ابا، اماں، اہلیہ (نسیمہ) کے علاوہ انعم اور ارم کا ذکر از حد ضروری ہے جنہوں نے مجھے گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد رکھا۔ عزیزم محمد اشرف سلمہ نے اپنی تمام تر تعلیمی مصروفیات کے باوجود اس کتاب کی کمپوزنگ سے لے کر طباعت تک کے ہر مرحلے میں پورا تعاون کیا جس کے لیے بطور خاص ممنون ہوں۔

تحقیق، اصول و نظریات اور اس کی اہمیت

تحقیق، اصول ونظریات اوراس کی اہمیت

تہذیب یافتہ سماج خود کو جاننے اور سمجھنے کی پوری کوشش کرتا ہے اور وہ اپنی اس کوشش میں اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں کرسکتا جب تک کہ اس کے پاس اپنے آباء و اجداد کے کارناموں کی مکمل تاریخ نہ ہو۔ اس تاریخ کو مرتب کرنے میں ادبی کارناموں اور ادبی تاریخ کی کھوج اور ان سے متعلق حقائق کی تعبیر وتشریح کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقائق کو دریافت کرنے اور ان کی تصدیق کرنے کا نام تحقیق ہے۔ تحقیق ہی کے ذریعہ صحیح اور غلط کے مابین امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ ایک بے حد خشک موضوع کا نام تحقیق ہے۔ تحقیق خشک ہی نہیں مشکل بھی ہے۔ اس سے بھی مشکل بلکہ مشکل ترین کام کا نام ترتیب وتدوین متن ہے۔ فن تحقیق جس کا ایک اہم حصہ ترتیب وتدوین متن ہے، تقاضہ کرتا ہے خلوص ودیانت داری کا۔ یہاں جذبات ورواداری، حمایت یا مخالفت اور قیاس آرائی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ تحقیق سے ماضی کی صحیح بازیافت کی جاتی ہے۔ ادبی تحقیق بالخصوص متنی تنقید کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ تحقیق کے بغیر تخلیقی ادب کی معیاری اور صحیح تنقید ناممکن ہے۔ صحیح متن کے پیش نظر نہ ہونے اور تخلیق کے صحیح پس منظر کو سمجھے بغیر جو بھی تنقیدی نتائج برآمد کیے جائیں گے ان کی صحت اشتباہ سے خالی نہیں ہوگی۔ تحقیق کے بغیر تنقید منزل تک نہیں پہنچ

سکتی۔ تحقیق کی مدد سے تخلیق کی ادبی حیثیت کے تعین، تخلیق کار کے سماجی و معاشی ماحول، اس پر اثر انداز ہونے والے عوامل اور تخلیق کار کی ذہنی ارتقاء کو صحیح طریقے سے سمجھا جاسکتا ہے۔ تاریخی تنقید میں تحقیقی نقطہ نظر کے بغیر نقاد غلطیوں کا ارتکاب کرسکتا ہے۔

پانچ حرفوں پر مشتمل یہ لفظ باب تفعیل کا مصدر ہے، جس کا مادہ ح، ق، ق ہے۔ لغت میں اس کے معنی تلاش، جستجو، کھوج، تفتیش، دریافت اور چھان بین کے ہیں۔

تحقیق ہر فرد کو کچھ نہ کچھ سوچنے اور غور وفکر کرنے پر مجبور کرتی ہے خواہ مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا جوان یا بوڑھا۔ ہر ایک کی فطرت غور وفکر کرنا اور سوچنا ہے۔ حضرت آدم سے لے کر آج تک غور وفکر کا عمل جاری ہے۔ اللہ تعالی نے حضرت آدم وحوا کو گندم یا اس طرح کا کوئی اور پھل کھانے سے منع کیا تو ابلیس نے جا کر انہیں سمجھایا اور بہکایا کہ اگر آپ لوگوں نے اس شجر ممنوعہ کا پھل کھالیا تو ہمیشہ کے لیے جنت میں رہیں گے۔ اللہ آپ لوگوں کو جنت میں زیادہ دنوں تک رکھنا نہیں چاہتا، اسی لیے اس نے اس کے کھانے سے منع کیا ہے۔ آدم وحوا ابلیس کے بہکاوے میں آ گئے اور سوچا کہ اگر ہم لوگ اسے کھائیں گے تو ہمیشہ کے لیے یہیں جنت میں رہیں گے ورنہ کہیں اور بھی بھیجے جاسکتے ہیں، غور وفکر کرنے کے بعد اسے کھا ہی لیا۔ حکم عدولی کی بنا پر جنت سے نکال کر زمین پر بھیج دیئے گئے۔ حضرت ابراہیم نے خدا کی تلاش وجستجو کی، بہت غور وفکر کیا اور یہ جاننا چاہا کہ ہمارا خدا کون ہے؟ انہوں نے کبھی ستاروں کو، کبھی چاند کو، کبھی سورج اور دیگر اشیا کو خدا سمجھا۔ خدا کی تلاش کرتے رہے بالآخر بڑی تلاش وجستجو کے بعد اپنے معبود حقیقی کو پا ہی لیا۔ صرف یہی نہیں بچے بھی اپنے بزرگوں اور بڑوں سے طرح طرح کے سوالات کرتے ہیں اور چیزوں سے متعلق جاننا چاہتے ہیں، اگر بچے کی موجودگی میں اس کا باپ کہیں جارہا ہوتا ہے تو وہ پوچھتا ہے ''ابا آپ کہاں جارہے ہیں؟'' اسی طرح بچے کی موجودگی میں جب اس کا باپ گھر واپس آتا ہے تب بھی بچہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ ابا کہاں گئے تھے؟ بچہ کوئی چیز دیکھتا ہے تو اس کے متعلق دریافت کرتا ہے کہ ''یہ کیا ہے؟ کہاں تھی؟ اسے کون لایا ہے؟'' بچے ہی کیا،

ہم بھی جب اپنے پڑوسی کے گھر کسی نئے چہرے کو دیکھتے ہیں تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کس لئے آیا ہے؟ اور اس سے متعلق ہم قیاس آرائیاں کرنے لگتے ہیں۔ غرض یہ کہ تحقیق، تلاش و جستجو، دریافت اور چھان بین انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے۔

تحقیق کرتے وقت زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مدلل اور سائنسی طرز میں مطالعہ کیا جاتا ہے۔ لوگوں نے تحقیق کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔

قاضی عبدالودود:

''تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے'' ۱؎

عندلیب شادانی:

''تحقیق یعنی ریسرچ کا مطلب یہ ہے، یا تو نئے حقائق دریافت کئے جائیں یا پھر معلومہ حقائق کی کوئی ایسی نئی تعبیر پیش کی جائے کہ اس سے ہماری معلومات میں معتد بہ اضافہ ہوجائے'' ۲؎

پروفیسر عبدالستار دلوی:

''تحقیق کسی مسئلے کے قابل اعتماد حل اور صحیح نتائج تک پہنچنے کا وہ عمل ہے، جس میں ایک منظم طریقۂ کار، حقائق کی تلاش، تجزیہ اور تفصیل کاری پوشیدہ ہوتی ہے'' ۳؎

جمیل جالبی:

''تحقیق دراصل تلاش و جستجو کے ذریعہ حقائق معلوم کرنے اور ان کے تصدیق کرنے کا نام ہے، یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے آپ صحیح اور غلط میں امتیاز کرتے ہیں اور پھر صحیح کی مدد سے اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہیں'' ۴؎

ڈاکٹر سید عبداللہ:

''تحقیق کے لغوی معنی کسی شئ کی حقیقت کا اثبات ہے، اصطلاحاً یہ ایک ایسے طرز مطالعہ کا نام ہے جس میں ''موجود مواد'' کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔'' ۵؎

ڈاکٹر تلک سنگھ:

''تحقیق علم کا وہ شعبہ ہے جس میں منظم لائحہ عمل کے تحت سائنسی اسلوب میں نامعلوم و ناموجود حقائق کی کھوج اور معلوم و موجود حقائق کی نئی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ علم کے علاقے کی توسیع ہو۔'' ۶ے

شیریڈن بیکر:

''ریسرچ کے معنی دوبارہ تلاش کرنا ہیں، یعنی جہاں دوسروں نے تلاش کی وہیں پھر تلاش کر کے ایک نئی بات کھوج نکالنا، جو دوسرے نہیں ڈھونڈ پائے تھے۔'' ۷ے

اردو میں تحقیق کے معنی سچ یا حقائق کی دریافت اور کھوج کے ہیں، ہندی میں انوسندھان کے معنی کسی مقرر نشانے کو حاصل کرنے کے لیے اس کا تعاقب کرنا اور انگریزی میں ریسرچ کے معنی ہیں کھوج اور دوبارہ کھوج۔

تحقیق کرتے وقت ایک مسلسل عمل، دلجمعی اور پوری جدوجہد کے ساتھ نام ونمود سے دور رہتے ہوئے کسی خاص موضوع سے متعلق نئے حقائق کی تلاش یا معلوم اور موجود حقائق کا دوبارہ جائزہ اور اس کی بازیافت کی جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس موضوع سے متعلق تحقیق کی جارہی ہے اور وہ کام جس پر تحقیق کی گئی ہے صحیح ہو۔ تحقیق پوری کی پوری صحیح ہوسکتی ہے اور غلط بھی، تحقیق کا کچھ حصہ صحیح اور کچھ حصہ غلط بھی ہوسکتا ہے، تحقیق شدہ کام غلط ہوجانے سے اس کا مقصد فوت نہیں ہوجاتا۔ اسلام میں کسی مسئلے پر عمل پیرا ہونے کے لیے سب سے پہلے قرآن کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اگر قرآن میں اس مسئلے کا حل نہ ہوتو حدیث ہے۔ اگر یہاں بھی اس کا حل نہیں تو اجماع امت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اور اگر اس جگہ بھی اس مسئلہ کا حل نہیں تو سب سے آخر میں قیاس کا نمبر آتا ہے۔ یہاں اس مسئلہ سے متعلق سوچنے اور غور وفکر کرنے کے بعد جو صحیح اور درست سمجھا جائے گا، اس پر عمل کیا جائے گا۔ صحیح سمجھتے ہوئے جس مسئلہ پر عمل کیا گیا ہے اگر وہ غلط ہوا تو ایسا نہیں کہ عامل گنہگار ہوگا۔ اگر مسئلہ صحیح ہے تو دوگنا ثواب ورنہ ایک ثواب ملے گا۔ یہی معاملہ تحقیق کا ہے

کہ تحقیق شدہ چیز غلط ہوگئی تو ایسا نہیں کہ اس کی محنت اور ساری کوشش رائیگاں اور ضائع ہوگئی بلکہ یہی کام دوسرے محققین کو تحقیق کی طرف رغبت دلاتی ہے۔

جو چیزیں ہمارے سامنے نہیں ہیں جن کے بارے میں ہم نہیں جانتے، انہیں ڈھونڈنا اور ان سے متعلق معلومات حاصل کرنا اور اسی طرح جن چیزوں کے بارے میں ہم کچھ جانتے ہیں مگر وہ ہمارے سامنے واضح نہیں ہیں ان کو وضاحت کے ساتھ پیش کرنا ہی محقق کا کام ہے۔

فطرتاً ہر فرد محقق واقع ہوا ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں تحقیقی عمل ملتا ہے، لوگوں نے تحقیق کی تقسیم مختلف انداز سے کی ہیں۔

پروفیسر عبدالستار دلوی تحقیق کی چار قسمیں بیان کرتے ہیں۔

تجرباتی تحقیق، تاریخی تحقیق، تنظیمی تحقیق اور عملی تحقیق

تجرباتی تحقیق روایتی انداز کی ہوتی ہے، اس انداز کو سائنس داں حضرات استعمال کرتے ہیں۔ محقق کسی چیز (مفروضہ یا اصول) کا جائزہ لینے کے لئے تجربہ کرتا ہے۔ تجرباتی تحقیق کے لئے بنیادی نقطۂ کار ایک مفروضہ ہوتا ہے، تجرباتی تحقیق تجربہ گاہوں میں کی جاتی ہے، اس میں یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ وہ (مفروضہ) صحیح ہے یا غلط۔

تاریخی تحقیق میں حالات کا سلسلہ وار جائزہ لیا جاتا ہے۔ تاریخی تحقیق سے ماضی کے بارے میں جاننے اور اس سے کچھ سیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس میں شہادتوں کو جمع کیا جاتا ہے اور پھر ان کو پیش کر کے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں، انہیں نتائج سے مفروضے کا صحیح و غلط ہونا طے ہوتا ہے۔

تنظیمی تحقیق دوسری جنگ عظیم کے دوران ارتقا پذیر ہوئی۔ اس کا مقصد فوجی جنگی محاذ کا نقشہ تیار کرنے والے ذمہ داران کا بڑے پیمانے کے تنظیمی مسائل سے نپٹنا تھا۔ تنظیمی مسائل کے لیے ریاضی کے ضوابط اور اصول و طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ ان عوامل و تعلقات کو جاننے کی کوشش کرتی ہے جن کے تحت مختلف تنظیمیں کام کرتی ہیں۔

عملی تحقیق کا کام کسی چیز کو قائم کر کے اس کا ردعمل دیکھنے کے لیے اس کو آگے بڑھانا ہوتا ہے، عملی تحقیق اس وقت کہا جائے گا جب اس منصوبے یا عمل کے مقصد کا تعین مسلسل انداز میں کیا جائے اور اس کے اندر کچھ محرکات بھی موجود ہوں۔ جو اس کے تعین اور بڑھی ہوئی چیزوں کو اس تحقیقی عمل میں اس طرح ضم کر دیں کہ وہ تجربے کی روشنی میں ایک وقیع چیز بن جائے۔ عملی تحقیق لائبریریوں اور تعلیمی اداروں میں کی جاتی ہے۔

ادب تحقیق و تنقید سے متعلق ہے۔ ایک وقت تھا جب ادب کا تعلق صرف تنقید اور تبصرے سے تھا معاشرتی علوم وفنون کے وجود میں آنے کے بعد تحقیق کو ادب کے زمرے میں شامل کیا گیا۔ ادب داخلی تحقیق کا موضوع بن گیا جس میں محقق تجرباتی عمل کے حدود سے باہر نہیں نکلتا۔ ادب میں خارجی تحقیق کے امکانات بھی پیدا ہوئے، اس میں دیگر موضوعات کا سہارا لے کر نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔

ہندی کے مشہور محقق ڈاکٹر دین دیال گپت کا تحقیق کے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ تحقیق کے تین میدان ہیں، شعری ادب، شعری ادب کا فنی پہلو اور کتابوں کی تاریخ۔ انہوں نے انہیں کو سامنے رکھتے ہوئے تحقیق کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

خالص ادبی، فنی اور تاریخی حقائق سے سروکار رکھنے والی۔

اس کے بعد تحقیقی مواد کو مدنظر رکھتے ہوئے سات قسمیں بتلائی ہیں۔

حقائق اشیا کی تحقیق، جذبات کی تحقیق، افکار کی تحقیق، روایات کی تحقیق، فنی تحقیق، لسانی تحقیق اور تدوین متن۔

ڈاکٹر راوت اور کھنڈیل وال تحقیق کے لئے یہ طریقے بیان کرتے ہیں:

''(۱) تاریخی یا ارتقائی طریقہ (۲) تشریحی طریقہ (۳) حقائق سے تعلق رکھنے والا وضاحتی نیز جائزے والا طریقہ (۴) تقابلی طریقہ (۵) تجرباتی طریقہ (۶) ادب کے علاوہ دوسرے علوم کی تحقیق کا طریقہ۔'' [۸]

یہ تھے ہندی تحقیق کے اقسام و اجزاء، اردو تحقیق کی تقسیم اس طرح کی جا سکتی ہے۔

سوانحی و تاریخی تحقیق جس میں کسی ادیب، اس کی تصانیف یا صنف پر مشتمل تصانیف پر تحقیقی گفتگو کی جاتی ہے۔ تدوین متن، حوالہ جاتی تحقیق میں وضاحتی فہرستیں، اشاریئے اور انسائیکلو پیڈیا وغیرہ تیار کیا جاتا ہے، بین العلومی تحقیق جس میں ادب اور دوسرے مضامین پر تحقیق کی جاتی ہے۔

الانسان مرکب من الخطأ والنسیان (ہر انسان خطا اور بھول چوک سے مرکب ہے) کے تحت ہر انسان سے غلطی ہوسکتی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ محقق کسی بھی چیز کو اس نظریہ سے دیکھے کہ اس میں غلطی یا بھول چوک ہوئی ہوگی۔ اچھا محقق وہی ہوسکتا ہے جو ہر کام کو شک کی نظر سے دیکھے کہ اس میں غلطی ہوئی ہوگی۔ تحقیق کی ضرورت کسی بھی چیز یا معاملے میں شک پیدا ہو جانے کی وجہ سے محسوس کی گئی۔ اس کی شروعات شک سے ہوتی ہے، جب تک شک پیدا نہیں ہوگا تحقیق نہیں ہو سکے گی۔ ایلئٹ نے ٹھیک کہا ہے کہ:

''اچھا محقق ہونے کے لئے اچھا متشکک ہونا ضروری ہے انہوں نے تو اپنی ذات کو بھی شک کی نظروں سے دیکھنے کی ہدایت کی ہے۔'' ۹

کسی بھی مواد میں شک پیدا ہونے کے بعد اسے دستیاب کر کے جائزہ لیا جاتا ہے اور کوئی فیصلہ صادر کیا جاتا ہے کہ مشکوک مواد کس حد تک صحیح ہے یا غلط، اس مواد پر فیصلہ کرنے کے لئے لکھنے یا بیان کرنے والے کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ کتنا معتبر ہے۔ اسلام میں محدثین نے تخریج حدیث کے لئے جو اصول بنائے ہیں وہ مثالی اصول وضوابط مانے جاسکتے ہیں، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ:

''روایت کے بارے میں ان کے حزم واحتیاط کا عالم یہ تھا کہ نبرد مغازی تو بہت بڑی چیز ہے، وہ عام خلفاء یا سلاطین کے حالات اس وقت تک بیان نہیں کرتے جب تک کہ ان کے پاس آخری راوی سے لے کر چشم دید گواہ تک تسلسل کے ساتھ روایت موجود نہ ہو۔ یعنی جو واقعہ لیا جائے وہ اس شخص کی زبانی ہو جو خود شریک واقعہ رہا ہو اور اگر وہ خود شریک واقعہ نہیں تھا تو اس واقعے تک تمام درمیانی راویوں کے نام ترتیب کے ساتھ

بیان کئے جائیں اور ساتھ ہی یہ بھی تحقیق کی جائے کہ وہ لوگ کون تھے؟ کیسے تھے؟ ان کے مشاغل کیا تھے؟ ان کا کردار کیسا تھا؟ ان کی سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ کہاں تک تھے؟ سطحی الذہین تھے یا نکتہ رس تھے؟ عالم تھے یا جاہل؟'' [۱۰]

ان باتوں کا پتہ لگانے کے لئے بہت سے محدثین نے اپنی زندگیاں وقف کردیں۔ اگر کسی بھی راوی پر کذب، تہمت، بدعت، غفلت، ثقات کی مخالفت یا حافظے کی کمزوری وغیرہ کا الزام ہے تو محدثین نے بلا تکلف اس راوی کو مجروح اور اس کی روایت کو مردود قرار دے دیا۔ راوی یا درمیانی راویوں کی بنا پر حدیثوں کی کئی قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ مرفوع، موقوف، آحاد و متواتر، مشہور وغریب، صحیح، حسن، مقبول اور مردود وغیرہ حدیث کی قسمیں ہیں۔

مغربی محققین نے انہیں اصول روایت و درایت سے استفادہ کر کے تحقیق کے لیے اصول بنائے۔ ایک مشہور مغربی محقق (Carter V.Good) نے تحقیق کے لئے جو اصول بتائے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

''کسی واقعہ کو پرکھنے کے لیے خارجی اور داخلی شہادتوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے، مواد کہاں سے حاصل ہوا، راوی کون تھا، اس کے ذاتی حالات یعنی مزاج مذاق، کردار و گفتار کی نوعیت کیا تھی پھر اس خاص واقعہ کے کتنے عرصے کے بعد راوی نے اسے نقل کیا؟ وہ روایت محض حافظے کی بنا پر بیان کی گئی ہے یا کسی اور راوی نے بھی اس کی تصدیق کی ہے؟ اصل واقعہ کتنا ہے اور تحریف یا اضافہ کس حد تک ہے'' [۱۱]

مغربی محققین نے اسلامی طرز تحقیق اور محدثین کے بنائے گئے اصولوں سے استفادہ کر کے اپنی تحقیق کے معیار کو بلند سے بلند تر کیا ہے، ان کے بہت سارے اصول محدثین کے اصول سے ماخوذ ہیں۔ اردو محققین اہل مغرب سے بے حد متاثر اور مرعوب نظر آتے ہیں، انہوں نے مغربی محققین کے بنائے گئے اصول تحقیق کو بلا تأمل اپنایا جب کہ ہمیں چاہیے کہ اسلامی طرز تحقیق کو اختیار کریں اور روایت و درایت کے معاملے میں محدثین کے

بنائے گئے اصول پر عمل پیرا ہونے کی حتی الامکان کوشش کریں تبھی اردو تحقیق کا معیار بلند سے بلند تر ہوگا۔

تحقیق کا حق وہی ادا کر سکتا ہے جو ایماندار، دیانتدار، ذمہ دار اور مخلص ہو۔اس میں جذبات، قیاس آرائی اور بے جا حمایت و مخالفت کی گنجائش نہیں ہے۔ہاں تحقیق کے لئے تخیل ضروری ہے۔ایک شاعر کے لئے تخیل جتنا ضروری ہے محقق کے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہے۔محقق اسی کی مدد سے نئی نئی باتیں سوچتا ہے۔ بلا تخیل ایک انسان حقائق جمع تو کر سکتا ہے مگر اکتشافات نہیں کر سکتا۔

تحقیق دو جگہ رہ کر کی جاتی ہے، ایک درس گاہوں کے اندر رہ کر اور دوسری درس گاہوں کے باہر رہ کر کی جاتی ہے۔ درس گاہوں کے اندر رہ کر تحقیق کرنے والوں کی دو جماعت ہوتی ہے ایک ریسرچ اسکالر اور نو عمر اساتذہ جو پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لیے تحقیق کرتے ہیں یہ کثیر تعداد میں ہوتے ہیں۔طلبا کے ذریعے کی جانے والی تحقیق معیاری کم غیر معیاری زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی تحقیق کے غیر معیاری ہونے کی کئی وجوہات ہیں۔ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر بہت سی یونیورسٹیاں ایسی ہیں جہاں ایم۔اے کے بعد پی۔ایچ۔ڈی میں داخلے ہوتے ہیں اور کچھ یونیورسٹیوں میں ایم۔اے کے بعد ایم۔فل بھی کرایا جاتا ہے ،ایم۔فل میں ۔ م طور پر تحقیق اور تنقید سے متعلق امتحانات بھی ہوتے ہیں ،ایم۔فل میں تحقیق و تنقید کے اصول وضوابط اور طریقہ کار بتائے جاتے ہیں۔ ایم۔فل کے بعد ایک ریسرچ اسکالر کو دقتیں کم ہوتی ہیں۔مگر وہ طالب علم جو ایم۔اے کے فوراً بعد پی۔ایچ۔ڈی میں داخلہ لے لیتا ہے۔اسے کچھ زیادہ ہی دقتیں اور پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔کیونکہ ایم۔اے میں تحقیق و تنقید کے باقاعدہ مضامین نہیں پڑھائے جاتے۔ جب کہ ایم۔فل میں یہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں اور اس جماعت میں تحقیق و تنقید کے پڑھائے گئے اصول وضوابط کے مطابق ایک تحقیقی مقالہ بھی قلم بند کرایا جاتا ہے۔ تحقیق کے غیر معیاری ہونے کی بڑی وجہ طالب علم کی دلچسپی نہ دیکھنا ہے۔طالب علم کو اس

کی دلچسپی کے مطابق عنوان نہیں دیا جاتا۔ بلکہ کبھی کبھار اس کے مزاج سے مختلف موضوع دے دیا جاتا ہے۔ اس موضوع سے دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے تحقیق کا حق ادا نہیں ہو پاتا۔ اسی قسم کی تحقیق غیر معیاری ہوتی ہے۔ اس کے ذمہ دار کہیں نہ کہیں نگراں اور وہ اراکین ہوتے ہیں جو اس قسم کا موضوع دیتے ہیں۔ تیسری وجہ نگراں کا تعین ہے۔ دور حاضر میں اگران اساتذہ کا سروے کیا جائے جو پی۔ ایچ۔ ڈی کرارہے ہیں تو کئی باتیں سامنے آئیں گی۔ نمبر ایک ہمیں ایسے نگراں استاد ملیں گے جو خود پی۔ ایچ۔ ڈی نہیں ہیں مگر پی۔ ایچ۔ ڈی کرارہے ہیں۔ نمبر دو ایسے نگراں اساتذہ کی کمی نہیں جو صرف اس لئے پی۔ ایچ۔ ڈی کے طلبا کو اپنی نگرانی میں لیتے ہیں تاکہ یہ دکھا سکیں کہ ہم نے اتنی تعداد میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرائی ہے، نمبر تین ایسے اساتذہ بکثرت ملیں گے جو اپنے ریسرچ اسکالر کو وقت نہیں دیتے اور نہ ہی ان کے کاموں کو سنجیدگی سے دیکھتے ہیں بلکہ خواہ مخواہ کی مصروفیات کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔ نمبر چار کچھ نگراں اساتذہ اس قسم کے بھی ہوتے ہیں جو ایسے موضوعات پر بھی تحقیقی کام کرانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں جن کے بارے میں خود کوئی خاص علم نہیں رکھتے۔ اگر طلبا کے لئے تحقیقی موضوع کا انتخاب کرتے وقت ان کی دلچسپی کا خیال رکھا جائے، نیز وہی استاد اپنی نگرانی میں لے جو طالب علم کو وقت دے سکے اور طالب علم کے مقالے کے موضوع سے بخوبی واقف ہو تو اس قسم کی تحقیق کا معیار بھی بہتر ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ پی۔ ایچ۔ ڈی میں صرف اور صرف ان لوگوں کا داخلہ ہونا چاہئے جو علم و ادب اور تحقیق و تنقید کے معاملے میں سنجیدہ ہوں۔ آج ہر یونیورسٹی میں سنجیدہ اور غیر سنجیدہ طالب علم پی۔ ایچ۔ ڈی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ موضوع کے انتخاب اور طلباء کے داخلے میں کچھ مجبوریاں ضرور درپیش ہوتی ہیں۔ باوجود اس کے کوشش یہی ہونی چاہیے کہ طلبا کو ان کی دلچسپی کا موضوع دیا جائے۔ اچھے طالب علموں کا پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ دیا جائے۔

درس گاہوں میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جس نے معیاری تحقیق کا نمونہ پیش کیا

ہے۔ یہ جماعت ان تجربہ کار اساتذہ کی ہے جنہوں نے تحقیقی کام کسی سند یا ڈگری کے لئے نہیں بلکہ اپنے شوق اور دلچسپی کے لئے کیا ہے۔ ان اساتذہ کی تحقیق معیاری ہوتی ہے اور انہیں اساتذہ سے معیاری اور بہتر تحقیق کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ محققین کی ایک ایسی جماعت بھی ہے جس نے یونیورسٹیوں سے باہر رہ کر ناقابل فراموش تحقیقی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ان کی تحقیق مقدار میں کم ضرور ہے مگر معیار میں بلند و بہتر ہے۔ یونیورسٹیوں سے باہر کی تحقیق انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کی ہوتی ہے۔ درس گاہوں سے متعلق وغیر متعلق محققین کی فہرست طویل ہے۔

ایک محقق کو تحقیقی کام شروع کرنے سے قبل اور دورانِ تحقیق کئی باتوں کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ سب سے پہلے موضوع کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ تحقیق کے خواہش مند کو اپنے اندر کی صلاحیتیں دیکھنی چاہئیں، اسے یہ دیکھنا چاہئے کہ موضوع کا ایماندارانہ حق ادا کرسکتا ہے یا نہیں۔ تحقیق کرنے والے کو ایسے موضوع کا انتخاب کرنا چاہئے جس پر پہلے سے کچھ نہ کچھ جانکاری رکھتا ہو، موضوع کے انتخاب میں اپنی صلاحیتوں کا لحاظ رکھنا بہت ہی ضروری ہے۔ تحقیق کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوگی ان کی فراہمی پر بھی نظر ہونی چاہئے۔ تحقیقی موضوع کے لئے ایک خاکہ ضرور ہونا چاہئے، بغیر کسی خاکے کے موضوع کی تکمیل صحیح طریقے سے نہیں ہوسکتی اور نہ ہی یہ کام واضح اور منظم ہوسکتا ہے۔ تحقیق کے لئے ایسے موضوع کا انتخاب ہونا چاہئے جس پر آزادانہ قلم اٹھایا جاسکے۔ محقق کے لئے ضروری ہے کہ وہ راست گفتار اور عصبیت سے دور ہو۔ تحقیق میں دروغ گوئی، مبالغہ اور تعصب کے لئے کوئی جگہ نہیں، تحقیقی زبان میں تشبیہ و استعارے سے احتراز کرنا چاہئے۔ تحقیق کی عبارت ایسی ہونی چاہئے جو آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ تحقیقی عبارت کا واضح اور غیر مبہم ہونا بہت ہی ضروری ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ادبی و لسانی تحقیق اصول اور طریق کار، مرتبہ عبدالستار دلوی، شعبۂ اردو، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی، بار اول، ۱۹۸۴ء، ص: ۷۷

۲۔ ادبی ولسانی تحقیق اصول اور طریق کار، ص: ۸۹

۳۔ ایضاً، ص: ۱۳

۴۔ نئی تنقید، جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، بار دوم، ۱۹۹۴ء، ص: ۲۶

۵۔ ادبی ولسانی تحقیق اصول اور طریق کار، ص: ۱۱۱

۶۔ نووین شودھ وگیان، ڈاکٹر تلک سنگھ، پرکاش سنستھان، دلی، ۱۹۸۲ء، ص: ۲۰

۷۔ IThestylist,sheridan Beker's Thomas y Cromwell Co., New York 1977,P:85

۸۔ شودھ پرورِدھی اور پرکریا، ڈاکٹر چندر بھان راوت اور ڈاکٹر رام کمار کھنڈیل وال جواہر پستکالیہ، متھرا، ۱۹۷۹ء، ص: ۲۲۔۲۴

۹۔ The Art of Literary Research,Richard D. Altick, Norton & Co. New York,1967.P.16

۱۰۔ ادبی ولسانی تحقیق اصول اور طریق کار، ص: ۱۰۱

۱۱۔ Introduction to Educational Research,Corter V. Good,Meredith Publishing Company, New York1963 ص۲۵۷۔۲۵۹

اردو میں تحقیق کی روایت

اردو میں تحقیق کی روایت

ایک محقق تحقیق میں ماخذ، حقیقت اور صحیح واقعہ پر زور دیتا ہے۔ اس وقت اردو میں تحقیق سے متعلق بہت کام ہو رہے ہیں، ابتداءً اس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی۔ ان ایام میں تحقیقی رجحانات پائے جانے لگے تھے اگر دیکھا جائے تو میر کے نکات الشعرا میں تحقیقی رجحان پائے جانے لگے تھے، میر نہ تو محقق تھے اور نہ ہی اس تذکرہ کی ترتیب کے وقت حقائق کی تلاش وجستجو ان کا مقصد تھا۔ ان کے پاس ایسے وسائل اور اسباب بھی نہیں تھے۔ جس سے وہ تحقیق کرتے۔ باوجود اس کے ان کے تذکرے میں کچھ ایسی باتیں ضرور پائی جاتی ہیں جنہیں تحقیقی اشارے کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کچھ دوسرے تذکرہ نگاروں، سودا اور غالب کے یہاں بھی اس طرح کے رجحانات اور اس طرح کی باتیں مل جاتی ہیں۔ الفاظ و محاورات کی صحت وعدم صحت سے متعلق کچھ اشارے غالب کے خطوط میں نظر آتے ہیں۔ پھر بھی اسے باقاعدہ تحقیق کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ فرانسیسی محقق گارساں دتاسی نے سب سے پہلے قدیم اردو ادب پر تحقیقی کام کیا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا اردو سے متعلق یہ تحقیقی کام فرانسیسی زبان میں ہے۔

ادبی تحقیق کی دنیا میں سرسید احمد خاں، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا شبلی، مولانا

الطاف حسین حالی، سید سلیمان ندوی، مولوی محمد شفیع، حافظ محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، محی الدین قادری زور، نصیر الدین ہاشمی، مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، مالک رام، خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر نذیر احمد، رشید حسن خاں اور تنویر احمد علوی کے نام بہت ہی اہم ہیں۔ ان کے علاوہ غلام رسول مہر، عندلیب شادانی، جمیل جالبی، عبدالستار صدیقی، عبدالستار دلوی، سید عبداللہ، خلیق انجم اور گیان چند جین کے نام بھی کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ ان مذکورہ محققین نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اپنی جدو جہد اور لگن سے معلومات کا انبار لگا دیا۔ انہوں نے تحقیق و تدوین کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ ان محققین کے قلم سے بہت سے مسخ شدہ اور گم شدہ متون دریافت ہو کر صحیح صورت میں مصنف کے اصل متن کے ساتھ ہمارے سامنے آئے۔

سر سید احمد خاں نے اردو میں سب سے پہلے تحقیق کی طرف توجہ دی۔ انہوں نے قدیم متون کی ترتیب و تدوین کر کے اپنا نام اردو محققین میں شمار کرالیا۔ جام جم، آثارالصنادید، خطبات احمدیہ سر سید احمد خاں کی ایسی تصانیف ہیں جن میں تحقیقی رجحانات پائے جاتے ہیں۔ یہ کتابیں بہت ہی اہم ہیں۔ تاریخ فیروز شاہی، آئین اکبری اور تزک جہانگیری کے متون کی انہوں نے تصحیح و ترتیب کی۔ یہیں سے تحقیق اور ترتیب و تدوین کی شروعات ہوتی ہے۔ سر سید احمد خاں کو تحقیق و جستجو کا بے حد شوق تھا اور یہی شوق ان کے ساتھیوں میں بھی کہیں نہ کہیں نظر آتا ہے۔

اردو کے عناصر خمسہ میں مولوی محمد حسین آزاد کو تحقیق سے الگ رکھا گیا۔ انہیں محقق تسلیم نہیں کیا گیا۔ انہوں نے لسانی حقیقت نگاری پر سخندان فارس اور آب حیات میں روشنی ڈالی ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے اپنی کتابوں اور اپنی تحریروں میں تحقیقی اسلوب کے بجائے افسانوی اسلوب اختیار کیا ہے۔ دور حاضر میں تمام اصناف کے لئے الگ الگ اسالیب ہیں۔ مولوی آزاد کے عہد میں تحقیق کے لئے کوئی خاص اسلوب نہیں تھا اور نہ ہی باقاعدہ تحقیق کا آغاز ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جس اسلوب میں زیادہ اثر اور دلکشی پائی،

اسی کو تحقیق وتنقید میں استعمال کیا۔

مولوی محمد حسین آزاد نے آب حیات پوری محنت اور تحقیق کے ساتھ لکھی ہے۔ اس کے ذریعہ انہوں نے اردو میں تحقیق کی راہ کو ہموار کیا اور لوگوں کو اس کی طرف مائل کیا ہے۔ اس کتاب نے ناقدین ومحققین کو ایک نیا راستہ دکھایا ہے۔ دیوان ذوق کی ترتیب بھی محمد حسین آزاد کا اہم کام ہے۔

اردو نظم ونثر پر غیر معمولی اثرات ڈالنے والے مولانا الطاف حسین حالی کو جدید اردو ادب کا معمار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ انہوں نے سب سے پہلے زندگی اور ادب کے رشتے کو شعوری طور پر تلاش کیا ہے۔ انہوں نے کئی سوانح لکھی ہیں۔ ان کی سوانحی کتابوں میں حیات جاوید، یادگار غالب اور حیات سعدی سر فہرست ہیں۔ ان کتابوں میں انہوں نے حالات کی صحت پر زور دیا ہے۔ حقائق اور ان کے ماخذ کی تلاش کی کوشش کی ہے۔ ان کی لکھی ہوئی کچھ باتیں گرچہ غلط ثابت ہوگئی ہیں مگر اس سے ان کی کوشش اور محنت کا انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے واقعات کو ان کی صحیح شکل میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور یہ کوشش ان کی دیگر تصنیفات میں بھی پائی جاتی ہے۔ حالی کی جو بعض باتیں غلط ثابت ہوئی ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ اس وقت اچھے وسائل نہیں تھے۔ ان کی تحقیق میں کچھ خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ یہاں بھی وسائل کی کمی کے باوجود انہوں نے حقیقت کی تلاش و جستجو اور حالات و واقعات کو یکجا کرنے کی پوری کوشش کی اور ان کی یہی کوشش ان کے تحقیقی دلچسپی کی نشاندہی کرتی ہے۔

مولانا شبلی نعمانی ایک اچھے سوانح نگار، سیرت نویس، تاریخ نویس کے ساتھ تنقید نگار بھی ہیں۔ ان کے کچھ کاموں میں تحقیقی اثرات ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی کتاب شعرالعجم، موازنہ انیس و دبیر اور ترتیب تذکرہ گلشن ہند کا نام لینا ہی کافی ہے۔ انہوں نے اپنی بیشتر تصانیف میں خواہ وہ سوانحی، تاریخی یا تنقیدی ہوں تحقیقی نظر سے کام لیا ہے۔ اپنی کتابوں میں بڑی چھان بین اور تلاش وجستجو کے بعد اپنے نظریات پیش کئے ہیں۔ تحقیق

رو سے گرفت کی جانے والی کچھ خامیاں سامنے آئی ہیں مگر اس سے مولانا شبلی کی اہمیت کم نہیں ہوتی ہے۔

مولوی عبدالحق نے قدیم متون کی ترتیب وتدوین کا باقاعدہ آغاز کیا ہے۔ان کے بیشتر کام تحقیق وترتیب متن سے تعلق رکھتے ہیں ان کی وجہ سے بہت سے لوگ تحقیق کی طرف متوجہ ہوئے۔ خواجہ بندہ نواز کی معراج العاشقین ، ملا وجہی کی سب رس اور قطب مشتری، نصرتی کی گلشن اور علی نامہ کوانہوں نے تلاش کرنے کے بعد شائع کیا۔ انہوں نے ہر چیز کی چھان بین کی ہے۔ متن سے لے کر کاتب متن اور مرتب متن تک کے سلسلے میں معلومات فراہم کی ہے۔ باغ و بہار اور تذکرہ گلشن ہند کے لیے ان کے لکھے گئے مقدمے عالمانہ اور تحقیقی ہیں۔

حافظ محمود شیرانی نے لسانیات، تحقیق، تدوین اور تنقید میں اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ خالق باری، پرتھی راج راسا، مجموعہ نغز، ہجو سلطان محمود غزنوی، فردوسی پر چار مقالے اور قصہ چہار درویش ان کا اہم تدوینی اور تحقیقی کام ہے۔انہوں نے ادبی تحقیق کی دنیا میں بت شکنی کی شروعات کی۔ انہوں نے بت شکنی کی اور اہل قلم کو اپنی خدمات سے سکھلایا کہ اور محتاط بنیں۔ شیرانی کے نزدیک محقق کو خوش اعتقاد نہیں ہونا چاہئے۔ ان کے تحقیق کا طریقہ یہ تھا کہ لوگ جو بات اب تک مانتے چلے آئے ہیں اسے بلا تحقیق کیوں مانا جائے۔ وہ تحقیق کے بعد جن نتائج پر پہنچتے تھے بے کم وکاست بیان کر دیتے تھے۔ خالق باری کو امیر خسرو کی تصانیف سے خارج کر کے ضیاء الدین خسرو کی تصنیف قرار دینا۔ سلطان محمود غزنوی کی ہجو سے متعلق بیشتر اشعار کو مصنوعی اور جعلی قرار دینا اور مثنوی یوسف زلیخا کے فردوسی کی انتساب کا بطلان اور راسا کے بیان کردہ واقعات کی تغلیط ، راسا کے ایک بڑے حصے کو جعلی قرار دینا شیرانی کا اہم کارنامہ ہے۔ سلیمان ندوی نے سیرت النبی، عربوں کی جہاز رانی، خیام اور نقوش سلیمانی میں مواد کی تلاش وتحقیق اور پیش کش وترتیب کا ایسا مظاہرہ کیا ہے جو ہر لحاظ سے لائق ستائش ہے۔ سیرت النبی، عربوں کی جہاز رانی اور خیام ان کی

تحقیقی کتابیں ہیں۔

مولوی عبدالحق، محی الدین قادری زور اور نصیر الدین ہاشمی نے دکنی ادب پر اپنی خدمات پیش کر کے اردو ادب میں ایک اہم باب کا اضافہ کیا ہے۔ قادری زور نے تقریباً ۴۰ رسال تک اردو زبان وادب کی خدمت کی۔ ان کے زیادہ تر کام دکنی ادب سے متعلق ہیں۔ انہوں نے قدیم دکنی ادب کے شہ پاروں کی بازیافت اور دیگر اہم مخطوطات کو مرتب کیا۔ مرقع سخن اور تذکرہ اردو مخطوطات کے علاوہ انہوں نے گلزار ابراہیم، کیف سخن، متاع سخن، فیض سخن، کلیات قطب شاہ وغیرہ کو مرتب کیا اور اکثر مرتبہ کتابوں کے شروع میں دکنی ادب سے متعلق عالمانہ گفتگو بھی کی ہے۔ دکنی ادب پر کام کرنے والوں میں ایک اہم نام نصیر الدین ہاشمی کا بھی ہے۔ انہوں نے دکن میں اردو، یورپ میں دکھنی مخطوطات، اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست اور کتب خانہ آصفیہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد آندھراپردیش کے اردو مخطوطات کے ذریعہ ریسرچ اسکالرز کی بہت بڑی مدد کی۔ کتابوں کی وضاحتی فہرست ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ مولوی محمد شفیع نے فارسی زبان و ادب سے متعلق ہونے کے ساتھ کچھ ایسے مقالے لکھے اور تحقیقی خدمات انجام دیں جو جدید محققین کے لئے کارگر ثابت ہوئے۔ ان کی تحقیقی خدمات اور مقالات میں اختیار کئے گئے اصول وضوابط ریسرچ اسکالرز کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب تحقیق کے ساتھ تنقید کو بھی نگاہ میں رکھتے ہیں۔ کسی فن پارے کو تحقیق کے ساتھ پیش کرتے ہوئے اس کی قدر و قیمت اور اس کے مقام کا تعین بھی کرتے ہیں۔ تحقیق وتنقید کا یہ توازن بہت کم محققین کے یہاں نظر آتا ہے۔ مراثی اور ڈرامے رضوی ادیب کی تحقیق کے خاص موضوع رہے ہیں انہوں نے فیض میر، مجالس رنگین، فائز دہلوی اور دیوان فائز، متفرقات غالب، تذکرہ نادر، فسانہ عبرت اور تذکرہ گلشن ہند کو مرتب کیا۔ اسلاف میر انیس، ایرانیوں کا مقدس ڈرامہ، اردو اسٹیج اور ڈرامہ، لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، لکھنؤ کا عوامی اسٹیج اور ہماری شاعری ان کی تحقیقی وتنقیدی تصانیف ہیں۔

اردو زبان و ادب میں جتنے کام علامہ اقبال اور غالب پر ہوئے ہیں شاید ہی کوئی ایسا خوش نصیب گزرا ہو جس پر اتنے کام ہوئے ہوں، مولانا امتیاز علی خاں عرشی رامپوری کو غالب سے بے حد لگاؤ تھا۔ انہوں نے نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کے نام لکھے گئے غالب کے خطوط کو مکاتیب غالب کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا۔ غالب کے منتخب کلام کو انتخاب غالب اور دیوان غالب کو تاریخی ترتیب سے مرتب کیا۔ دیوان غالب نسخہ عرشی مولانا عرشی کا اردو والوں کے لئے نایاب تحفہ ہے۔ انہوں نے غالبیات سے متعلق فرہنگ غالب کے نام سے ایک اور کتاب شائع کی ہے۔اس کے علاوہ دستور الفصاحت، نادرات شاہی، سلک گوہر، دیوان ابی محجن، محاورات بیگمات، تاریخ محمدی، تاریخ اکبری اور امام سفیان ثوری کی تفسیر القرآن الکریم کو جدید اصول کے مطابق مرتب کیا ہے۔

اردو تحقیق کو باضابطہ ایک شعبہ بنا کر پیش کرنے والے قاضی عبدالودود نے تحقیق کا معیار خوب بلند کیا۔ اپنی تحریروں سے تحقیق و تنقید کو نئی سمت و جہت سے روشناس کرایا۔ ان کی تحقیقی خدمات اردو اور فارسی زبان و ادب سے متعلق ہیں۔ انہوں نے تدوینی کاموں میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ ترتیب متن کے وقت قاضی عبدالودود کے اختیار کئے گئے اصول اور طریق کار مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے متنی کام موضوع کے اعتبار سے غیر اہم ہیں۔ انہوں نے دیوان جوشش، دیوان رضا، قطعات دلدار، تذکرہ ابن امین اللہ، مآثر غالب اور قاطع برہان و رسائل متعلقہ کو تدوین کے تمام مطالبات کو پورا کرتے ہوئے مرتب کیا، عیارستان اور اشتر و سوزن کتابوں کے تحقیقی تبصرے پر مشتمل ہیں۔ان کا کل تصنیفی سرمایہ مضامین، مقالے، مقدمے اور تبصرے ہیں۔ قاضی عبدالودود نے دوسروں کی کتابوں پر بالاستیعاب تبصرہ کیا ہے اور ان کتابوں میں پائی جانے والی خامیوں اور بے احتیاطیوں کی سختی سے گرفت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں بت شکن محقق کہا گیا اور کچھ لوگوں نے تو ان کی تحقیق کو تخریبی تحقیق کا نام دیا ہے۔

تحقیق کو زندگی بھر کا سودا بنانے والوں میں مالک رام کا ایک اہم نام ہے۔
انہوں نے تحقیق کو بطور شوق اپنایا۔ انہوں نے اسلامیات، تذکرہ نگاری، مرقع نگاری، نثر نگاری اور تحقیق کے علاوہ غالب پر اپنی تالیفات پیش کی ہیں۔ ان کی مرتب کردہ کتابوں میں کلیات غالب (فارسی)، دیوانِ غالب (اردو)، خطوط غالب، غبار خاطر، خطبات آزاد، نذر عرشی وغیرہ بہت ہی اہم ہیں۔ انہوں نے اپنی بیشتر مرتبہ کتابوں میں صحت متن کے اہتمام کے ساتھ محققانہ حواشی لکھے ہیں۔ ان کے بہت سے مضامین تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کے ہیں۔ نا قابل فراموش خدمات کی وجہ سے انہیں کئی انعامات و اکرامات سے نوازا جا چکا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی نے عمدہ منتخبہ، کربل کتھا، گنج خوبی، دیوان بقا اور غالب کے غیر مطبوعہ فارسی خطوط حضرت غمگین کے نام اور خدنگ غدر کو جدید اصول کے مطابق مرتب کر کے شائع کیا، خواجہ احمد فاروقی ترتیب متن کے وقت ایک ایک لفظ کی چھان بین کرتے اور اصل متن کو مصنف کے مطابق پیش کرتے تھے۔ ان کی مرتب کردہ کتابیں عالمانہ اور محققانہ مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد کا محبوب موضوع غالب رہا ہے۔ انہوں نے غالب کی فارسی اور اردو نثر و شاعری پر کئی تحقیقی مقالے قلمبند کئے ہیں۔ ان کے مقالوں میں ترتیب متن سے متعلق مفید معلومات ہیں اور تخریج و تصحیح متن کے اصول بھی ہیں۔ رشید حسن خاں نے قدیم متون کی ترتیب و تدوین کر کے اردو تحقیق کے باب میں اہم اضافہ کیا ہے۔ بہت سی قدیم کتابوں کو جدید اصول کے مطابق نئے سرے سے مرتب کیا۔ رشید حسن خاں حالات و حقائق کی چھان بین، صحت متن اور ماخذ کی تلاش میں قاضی عبدالودود کی طرح بہت ہی محتاط رہتے تھے۔ تنویر احمد علوی کی تحقیق و تدوین کے اکثر موضوعات شعر و سخن سے متعلق ہیں۔ ان کی کتابوں میں اصول تحقیق و ترتیب متن کے علاوہ کلیات ذوق، انتخاب دواوین اور رسالہ تذکرات کی ترتیب و تدوین بہت ہی اہم ہیں۔ اصول تحقیق و ترتیب متن علوی صاحب کی ایسی کتاب ہے جو تمام ریسرچ اسکالرز اور جدید محققین کے لئے بہت ہی معاون و مددگار ہے۔

آزادی سے قبل اردو تحقیق کے دو ادوار

پہلا دور

- سرسید احمد خاں
- مولوی محمد حسین آزاد
- مولانا الطاف حسین حالی
- مولانا شبلی نعمانی

سر سید احمد خاں

(۱۷/ اکتوبر ۱۸۱۷ء۔ ۲۷/ مارچ ۱۸۹۸ء)

معمولی سی ملازمت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کرنے والے سر سید احمد خاں نے اپنی نظر ہمہ وقت بلند رکھی اور ہر جا اپنا نقش ثبت کر کے آگے نکل گئے۔ انہوں نے معاشی، معاشرتی، تمدنی، ثقافتی، عملی اور مذہبی بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ایسے اثرات مرتب کئے، جس سے سوچنے اور سمجھنے کے انداز بدل گئے۔ انہوں نے ایک ذہنی انقلاب پیدا کیا۔ ان کی تقریر و تحریر اور ان کے عملی اقدامات نے ایک تحریک کو جنم دیا۔ سر سید احمد خاں کی شخصیت جامع کمالات پر مشتمل تھی۔ ان کی کئی حیثیتیں تھیں، وہ بیک وقت مصلح، مفکر، ماہر تعلیم، صحافی، مؤرخ، صاحب اسلوب اور محقق وغیرہ تھے۔ ان کی شخصیت اور خدمات پر بہت کچھ کام کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے اردو ادب کو ایک نیا انداز اور ایک نیا اسلوب عطا کیا۔ ان کی تصنیفی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ اگر سر سید کے اردو نثری خدمات کا جائزہ لیا جائے تو انہیں اردو نثر کے مجتہد کہنے میں کوئی تأمل نہ ہوگا۔ ان کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لینے کے بعد ہر محقق اور صاحب علم داد تحقیق دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ تصنیف و تالیف کو بنایا۔ ان کی نشو ونما اہل علم اور اہل کمال کے مابین ہوئی

جس عہد میں پروان چڑھے اس سے متعلق مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''سرسید کی جس زمانے میں نشو ونما ہوئی دہلی میں اہل کمال کا مجمع تھا۔ اور امراء اور رؤسا سے لے کر ادنی طبقہ تک میں علمی مذاق پھیلا ہوا تھا۔ سرسید جس سوسائٹی کے ممبر تھے اس کے بڑے ارکان مفتی صدرالدین آزردہ، مرزا غالب اور مولانا صہبائی تھے۔ ان میں سے ہر شخص تصنیف وتالیف کا مالک تھا، اوران ہی بزرگوں کی صحبت کا اثر تھا کہ سرسید نے ابتدا ہی میں جو مشغلہ علمی اختیار کیا وہ تصنیف وتالیف کا مشغلہ تھا۔'' [۱]

اس سلسلے میں سرسید خود لکھتے ہیں:

''وہاں اکثر دوستوں اور بڑے بڑے نامی وباکمال لوگوں کا مجمع ہوتا تھا، غالب کی دلکش ومحبت آمیز بزرگانہ باتوں سے، آزردہ کی دلچسپ ودل ربا فصاحت سے، شیفتہ کی متین ونیم خندہ زن وضع سے اور صہبائی کی جاں نواز میخانہ کے محبت سے دل شاد شاد رہتا تھا'' [۲]

عام رواج کے مطابق انہوں نے بھی شعروشاعری کا انتخاب کیا۔ شاعری میں آہی تخلص اختیار کرتے تھے۔ جب انہیں احساس ہوا کہ ان کی طبیعت شاعری سے کوئی میل نہیں کھاتی اور نہ ہی شعروشاعری راس آرہی ہے۔ تو اس سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنی ساری توجہ اردو نثر کی طرف مبذول کی۔ جس میں انہوں نے مختلف علوم وفنون پر کتابیں اور مضامین لکھے۔ ان کے تحقیقی اور تنقیدی کارنامے بھی عالم وجود میں آئے۔ مولانا شبلی ان کی شاعری کے میدان میں قدم رکھنے اور پھر اسے چھوڑ کر نثر کی طرف متوجہ ہونے کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''اول وہ رواج عام کے اقتضا سے شاعری کے میدان میں آئے، آہی تخلص اختیار کیا اور اردو میں ایک چھوٹی سی مثنوی لکھی۔ جس کا ایک مصرعہ ان ہی کی زبانی سنا ہوا مجھے یاد ہے۔'' نام میرا تھا کام ان کا تھا'' لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کو شاعری سے مناسبت نہ تھی اس لئے وہ بہت جلد اس کوچے سے نکل آئے اور نثر کی طرف توجہ کی'' [۳]

سر سید احمد خاں کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی ہے۔ ہر کام بے حد دلچسپی سے کرتے تھے۔ جب کسی کام کا بیڑا اٹھاتے تو اس میں اس قدر محو اور مصروف نظر آتے اور اپنی دلچسپی ظاہر کرتے کہ وہ اسی کام کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور یہی ان کا خاص مقصد ہے۔ ہر کام یکساں شوق وذوق اور دلچسپی کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ ان کی تصنیف وتالیف سے متعلق مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں۔

''رنج میں، خوشی میں، صحت میں، بیماری میں، خلوت میں اور جلوت میں اس مشغلہ (تصنیف وتالیف) سے ان کا جی نہیں اکتاتا تھا۔ گرمی کی دوپہروں میں جبکہ ایک صبح خیز آدمی ضرور آرام لینا چاہتا ہے، یہ شخص ہمیشہ تصنیف وتالیف میں مصروف پایا جاتا ہے۔ بیماری کی حالت میں ان کو کبھی نہیں دیکھا کہ دوپہر کو پلنگ پر جاکر کمر سیدھی کی ہو، بارہا ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ علالت یا کسی اور وجہ سے رات کو نیند اچاٹ ہوگئی اور انہوں نے میز کرسی پر بیٹھ کر کسی مضمون کے لکھنے میں صبح کردی'' [۴۲]

ان کے وہ تصنیفی اور تالیفی کارنامے جو تحقیقی ہیں یا جن میں تحقیقی رجحانات اور تحقیقی میلانات پائے جاتے ہیں۔ درج ذیل ہیں۔ اور ان پر روشنی ڈالنے کی بالاختصار کوشش کی گئی ہے۔

سر سید احمد خاں کی تالیف کردہ فارسی کتاب جام جم کا موضوع تاریخی ہے۔ یہ کتاب اس وقت تالیف کی گئی۔ جب اردو کا زیادہ بول بالا نہیں تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ اردو تیزی سے پھیل رہی تھی۔ جب کہ فارسی زبان کا عام چلن تھا۔ اور ہر کوئی فارسی ہی میں خط وکتابت اور تصنیف وتالیف کرتا تھا۔ اس لئے انہوں نے جام جم کو زبان فارسی میں لکھا۔ اس وقت ان کی عمر ۳۲ رسال تھی۔ یہ کتاب بڑی تحقیق وتدقیق سے تقریباً سات مہینے میں مکمل کی گئی۔ اس میں سلطنت ہند سے تعلق رکھنے والے بادشاہوں کے نام کچھ اس طرح ہیں۔

امیر تیمور صاحبقراں، نصرت شاہ، اقبال خاں، دولت خاں، اختیار خاں، سلطان

محمود دولت خاں، خضر خاں، معزالدین ابوالفتح مبارک شاہ، محمد شاہ، سلطان علاء الدین، سلطان بہلول لودھی، نظام خاں المقلب بہ علاؤ الدین، سلطان سکندر شاہ، سلطان ابراہیم، ظہیرالدین محمد بابر بادشاہ، نصیرالدین محمد ہمایوں

بادشاہ (مرتبہ اول)، شیر شاہ عرف فرید خاں، اسلام شاہ عرف شہزادہ جلال خاں، فیروز خاں، محمد عادل شاہ عرف مبارز خاں، سلطان ابراہیم، سکندر شاہ عرف احمد خاں، نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ (مرتبہ دوم)، ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ، ابوالمظفر، نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ، سلطان داور بخش عرف مرزا بلاقی، شہاب الدین محمد شاہ جہاں بادشاہ، ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ، محمد معظم المقلب بہ شاہ عالم بہادر شاہ محمد معزالدین، شاہ زادہ خجستہ اختر رفیع الشان، محمد معزالدین جہاں دار شاہ، جلال الدین محمد فرخ سیر، محمد ابوالبرکات سلطان رفیع الدرجات، شمس الدین رفیع الدولہ، محمد شاہ جہاں بادشاہ ثانی، روشن اختر ملقب بہ ابوالفتح محمد شاہ بادشاہ، سلطان محمد ابراہیم، روشن اختر ابوالفتح محمد شاہ، مجاہدالدین محمد ابوالنصر احمد شاہ بہادر شاہ، عزیز الدین عالم گیر ثانی بادشاہ غازی، ابوالمظفر جلال الدین سلطان عالی گوہر شاہ عالم بادشاہ، ابوالنظر معین الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ اور ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی۔ ان ۳۴؍ بادشاہوں کا حال سترہ خانوں میں نقشوں اور جدولوں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ ان نقشوں میں بادشاہوں کا حال بہت مختصر مگر جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ہر بادشاہ سے متعلق ان جدولوں میں نام فرمانروا، نام پدر، نام مادر، قوم، سال ولادت، محل جلوس، عمر بوقت جلوس، سال جلوس، تاریخ جلوس، مدت سلطنت، سکہ، مدت عمر، سال وفات، تاریخ وفات، لقب بعد وفات، مدفن اور کیفیت سے متعلق معلومات افزا باتیں پیش کی ہیں، ان بادشاہوں کے حالات یکجا کرنے میں انہیں بہت محنت کرنی پڑی، اس کتاب میں سر سید احمد خاں ایک محقق، مؤرخ اور متجسس کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔

مولانا ضیاء الدین برنی کی ''تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی'' میں ان آٹھ بادشاہوں کا حال مذکور ہے، جو سلطان ناصرالدین محمود کے بعد ہوئے۔ اس کے علاوہ ان واقعات کا بھی تذکرہ

ہے جو فیروز شاہی کے تخت نشینی کے چھٹے سال تک واقع ہوے، اس میں پیش کیے گئے اکثر واقعات مولانا ضیاء الدین برنی کے دیکھے ہوئے یا اپنے بزرگوں سے سنے ہوئے ہیں۔ جنہیں ان کے بزرگوں نے خود دیکھا ہے۔ ضیاء الدین برنی اور اس کی کتاب تاریخ فیروز شاہی کے بارے میں مولانا الطاف حسین حالی یہ رائے قائم کرتے ہیں:

> یہ ایک نہایت معتبر اور مستند تاریخ ہے، جس کا مصنف ضیاء الدین برن (یعنی بلند شہر) کا رہنے والا ہے۔ بہت بڑا فاضل اور راست بیانی میں ضرب المثل ہے'' ۵

اس کتاب میں غیاث الدین بلبلن، معزالدین کیقباد، جلال الدین فیروز خلجی، علاؤ الدین خلجی، قطب الدین مبارک شاہ، غیاث الدین تغلق شاہ، سلطان محمد تغلق شاہ اور سلطان فیروز شاہ کا حال بڑی سنجیدگی اور راست بیانی سے لکھا گیا ہے۔ مصنف نے ہر بادشاہ کی خوبیوں اور بھلائیوں کے ساتھ عیوب ونقائص اور اس کی سلطنت میں پائی جانے والی کمیوں کو ایمانداری سے لکھا ہے۔ مما لک ایشیا کی اکثر تاریخی کتب بادشاہوں کی بے جا تعریف اور خوشامد سے پر ہیں۔ مگر تاریخ فیروز شاہی اس سے مبرّ ا نظر آتی ہے۔ ہاں سلطان فیروز شاہ کی طرفداری ضرور نظر آتی ہے۔ تاریخ فیروز شاہی کے دیباچہ میں سر سید احمد خاں خود لکھتے ہیں:

> ''میں یہ نہیں کہتا کہ سلطان فیروز شاہ کا حال بھی اس مصنف نے ایسا ہی لکھا ہے کیونکہ میں اس کے حال میں اس طریقہ کو گھٹا ہوا پاتا ہوں، صحیح ہے کہ کسی بادشاہ کی تاریخ اسی بادشاہ کے عہد میں بغیر طرفداری کے لکھنی نہایت مشکل ہے۔'' ۶

یہ کتاب ہندوستان کے اسلامی عہد کی فارسی تاریخوں میں نہایت مستند اور معتبر سمجھی جاتی ہے، تاریخ فیروز شاہی کے جو قلمی نسخے مختلف جگہوں پر اور مختلف لوگوں کے پاس تھے۔ وہ ایک دوسرے سے کافی مختلف تھے۔ ان میں بے حد اغلاط بھی تھے۔ سر سید احمد خاں کو اس طرح کی علمی تحقیق کا بے حد شوق تھا۔ چونکہ اس نوعیت کی تحقیق اس سے قبل آثار الصنادید اور آئین اکبری میں کر چکے تھے۔ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے سکریٹری نے

۱۸۶۱ء میں اس کتاب کی تصحیح کی ذمہ داری سرسید کو سونپی، کافی جدوجہد کے بعد چار مختلف نسخ ملے۔ انہوں نے ان نسخوں کا باہم موازنہ، مقابلہ اور ہر نسخے کے متن پر غوروفکر کرنے کے بعد ایک صحیح ترین اور مکمل نسخہ مرتب کیا۔ اوراس پر سیر حاصل ایک دیباچہ لکھا۔ دیباچے میں انہوں نے اپنی محنت ومشقت اور جدوجہد کو یوں بیان کیا ہے:

'' تاریخ فیروز شاہی ضیا برنی بہت کمیاب کتاب ہے۔ بہت تلاش کے اور تجسس سے مجھ کوایک نسخہ بہم پہونچا تھا۔ اس کے مقابلے اور صحت میں مجھ کو بہت دقت اٹھانی پڑی۔ ایک ناقص نسخہ کتب خانہ شاہ دہلی سے مجھے میسر ہوا تھااور ایک نسخہ جومسٹر ایلیٹ صاحب بہادر نے بہم پہونچایا تھا۔ وہ میں نے لیا اور ایک نسخہ ایڈورڈ طامس صاحب بہادر کے پاس تھا۔ وہ بھی میں نے لیا۔ اور ایک نسخہ بنارس سے آیا۔ ان چارنسخوں سے میں نے اپنی کتاب کا موازنہ کیااور جہاں تک ممکن تھا اس کوصحیح کرنے کی کوشش کی'' [ے]

سرسید کی اس محنت اور کوشش کو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے ۱۸۶۳ء میں شائع کیا۔ اس ایڈیشن سے سینکڑوں محققین نے استفادہ کیا ہے فیروز شاہی سے متعلق تین کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ایک ضیا برنی کی تاریخ فیروز شاہی ہے۔ دوسری کتاب اسی نام کی (تاریخ فیروز شاہی) شمس سراج عفیف کی ہے۔ جب کہ تیسری کتاب فتوحات فیروز شاہی کے نام سے مشہور ہے، جو کہ خود فیروز شاہی کی لکھی ہوئی ہے۔ سرسید احمد خاں نے جس تاریخی کتاب کے متن کی تصحیح کی ہے وہ مولانا ضیا برنی کی کتاب تاریخ فیروز شاہی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر سوانح عمری لکھنے کی ضرورت سرسید احمد خاں نے اس وقت محسوس کی، جب دیکھا کہ عام مسلمانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بہت سی نامعتبر اور لغو باتیں پیدا ہوگئی ہیں، نئی نئی باتوں اور بدعات نے ان کے دلوں میں گھر کرلیا ہے بہت سی من گھڑت اور فرضی کہانیاں رسول اللہ سے مولود خوانوں نے جوڑ دی ہیں۔ جن کا صحیح حدیثوں میں کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اس وقت مجلس مولود کے بارے میں جو خیال تھا اسے سرسید احمد خاں اس طرح رقم کرتے ہیں:

''اس وقت خیال تھا کہ مولود کی مجلس ایک مذہبی امر اور بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔ اور بہشت کی نعمتوں کے ملنے کی کنجی ہے۔ مجلس مولود میں پیغمبر صاحب کی ارواح پاک موجود رہتی ہے۔ اور رحمت کے فرشتے اترتے رہتے ہیں۔ خصوصاً ہماری مجلس میں جو بالکل سادہ اور زوائد بیہودہ سے اور صرف درود خوانی ہے اور تمام باتوں سے مشابہ مرثیہ خوانی یا کتاب خوانی کی ہوں پاک ہے۔'' [۸]

رسول پاک پر اس مرتب کردہ سوانح عمری میں من گھڑت واقعات، فرضی کہانیوں اور وضعی روایات کا عنصر بہت کم ہے۔ کچھ روایتیں اس طرح کی ضرور ہیں، جن کی نشاندہی انہوں نے کردی ہے انہوں نے بڑی تحقیق وتفتیش اور جستجو کے بعد سیرت نبوی پر مشتمل جلاء القلوب بذکر المحبوب کے نام سے ایک مختصر رسالہ مرتب کیا انہوں نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب سرمد المحزون کو اصل ماخذ بنایا اور کچھ باتیں مدارج النبوۃ سے لی ہیں۔ ان کی کوشش تھی کہ ایک ایسا تحقیقی رسالہ تیار ہو جس میں ایسے حالات اور واقعات پیش کئے جائیں جو سچائیوں پر مبنی ہوں۔ من گھڑت اور فرضی نہ ہوں۔ پھر بھی سرسید احمد خاں کے مطابق اس میں بہت سی نامعتبر اور لغو باتیں ہیں۔ اس رسالے میں تمہید کے بعد بیان ولادت، اسمائے مبارکہ، حلیہ شریف، بیان سیر جمیلہ، صحابہ کرام، عشرہ مبشرہ، دواب، معجزات اور حجۃ الوداع کے نام سے عنوانات قائم کر کے سیر حاصل اور تسلی بخش گفتگو کی ہے۔ سیرت مبارکہ سے متعلق جو لغو باتیں تھیں انہیں بڑی تحقیق وجستجو کے بعد دلائل سے رد کیا ہے۔ احادیث صحیحہ کی روشنی میں آپ کے جملہ اخلاق و عادات، سیرت وشخصیت اور معجزات واحوال وغیرہ کو لکھا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں قدیم اسلوب نگارش کا واضح نمونہ پایا جاتا ہے:

''اللہ تعالی نے اس کا نام نبی الرحمت رکھا، اور اس کے تئیں امت کے شفاعت کا اختیار دیا۔ اس کے اشارے سے شق القمر ہوا۔ اس کی ذات پاک سے چراغ ہدایت روشن ہوا۔ اور ہمارے جناب پیغمبر خدا ﷺ کا اسم شریف محمد ہے۔ یعنی اللہ اور جمیع

مخلوقات کا ممدوح اللھم صل وسلم علی محمد وعلی آل محمد اور آپ کے والد ماجد کا نام عبد اللہ اور دادا کا نام عبد المطلب اور آپ کے پردادا کا نام ہاشم ہے اور آپ کی جانب والدہ ماجدہ کا اسم مبارک آمنہ بنت وہب ہے کہ وہ بھی قریشی ہیں۔'' 9

مندرجہ بالا اقتباس کے ہر جملے میں قدیم اسلوب نگارش اور قدیم طرز تحریر کی جھلک نظر آتی ہے۔ آج بھی جلاء القلوب بذکر المحبوب کا ایک قدیم نسخہ لاہور پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔ اس کتاب کی تکمیل ۱۲۵۸ھ اور اشاعت ۱۲۵۹ھ میں ہوئی۔

سرسید احمد خاں کا ایک اور ناقابل فراموش تحقیقی کارنامہ آئین اکبری کی تصحیح ہے۔ علامہ ابو الفضل کی یہ فارسی کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی ترتیب وتدوین سرسید نے اس وقت کی جب وہ دہلی میں منصف تھے۔ دہلی کے ایک مشہور تاجر حاجی قطب الدین کی فرمائش پر انہوں نے آئین اکبری کی تصحیح کا کام شروع کیا۔ یہ کتاب زبان و بیان کے اعتبار سے فارسی زبان کی دیگر تصانیف سے مختلف تھی، اس کے مضامین ایسے تھے کہ پڑھنے سے جی گھبراتا تھا، دوسرے یہ کہ کاتبوں کی کرم فرمائیوں سے آئین اکبری کے اکثر نسخے مسخ ہوگئے۔ اس کی تصحیح ایک محنت طلب اور جانفشانی کا کام تھا۔ انہیں اس طرح کے مفید اور دشوار کاموں میں بڑا مزہ آتا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس چیلنجنگ کام کو قبول کر کے بحسن وخوبی انجام دیا اور صحیح وغلط کئی نسخوں کو دستیاب کر کے باہم ایک دوسرے سے موازنہ کر کے ایک صحیح نسخہ تیار کیا اور اکبر کے زمانے میں آئین کے متعلق مستعمل اور علامہ ابو الفضل کی اختراع کردہ اصطلاحات کی شرح کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے غریب الفاظ کی بھی جابجا شرح کی، تمام نسخوں میں خالی جدولوں کو اور ان جدولوں کو جن میں ابو الفضل سے غلطیاں سرزد ہوگئی تھیں انہیں دیگر کتابوں سے تحقیق کر کے پر اور درست کیا۔ نیز کچھ جدولوں اور خانوں کا اضافہ بھی کیا، سکوں سے متعلق تفصیلی جانکاری پیش کی۔ تصحیح آئین اکبری میں سکوں اور مغل زیورات کے بیان کے وقت حاشیے لکھے۔ اکبری سکوں اور زیورات کی تصویریں دیں، ٹکسالی ترازوئے آبی، ترازوئے ہوائی،

شکار اور حملے، اکبر کی آتش پرستی اور آئین شکوہ سلطنت اور دیگر چیزوں کی ادھوری اور غیر واضح تصویریں جو آئین اکبری میں تھیں۔ انہیں دہلی کے مشہور اور ماہر مصوروں سے بنوا کر اس کتاب میں شامل کیا۔ اُس زمانے کے اوزان ونقود کی، اس زمانے کے اوزان ونقود سے مطابقت دکھلائی۔

علامہ ابو الفضل نے آئین اکبری کو زبان فارسی میں تین جلدوں میں لکھا۔ سرسید احمد خاں نے اسے مرتب کیا۔ اس کی پہلی اور تیسری جلد مطبوعہ شکل میں کہیں کہیں دستیاب ہیں۔ ہاں اس کی دوسری جلد غدر کی نذر ہوگئی۔ انہوں نے دوسری جلد کے ساتھ ایک طویل دیباچہ بھی چھپنے کے لئے بھیجا تھا۔ اس سلسلے میں مولانا الطاف حسین حالی رقم طراز ہیں:

''اور ایک لمبا دیباچہ جو گویا آئین اکبری پر ایک مفصل ریویو تھا۔ تحریر کر کے دوسری جلد کے ساتھ دلی میں چھپنے کو بھیجا، لیکن افسوس کہ یہ جلد ابھی چھپنے نہ پائی تھی کہ غدر ہوگیا اور اس کے جس قدر فرمے چھپ چکے تھے۔ وہ اور تمام مسودہ اور دیباچہ سب تلف ہوگئے۔'' [۱۰]

آئین اکبری کی تدوین اور اس کے متن کی تحقیق جس دلچسپی، لگن، محنت اور انداز میں سرسید نے کی ہے۔ وہ یقیناً لائق ستائش ہے۔ آئین اکبری کے حوالے سے سرسید کی اس خدمت کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی لکھتے ہیں:

''متنی تحقیق وتدوین کا اردو میں غالباً یہ (تصحیح آئین اکبری) پہلا کام تھا۔ اس لحاظ سے سرسید کی ایک بڑے اور دیدہ ور محقق کی بھی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے۔'' [۱۱]

سر ولیم میور، ڈاکٹر اسپرنگ اور اکثر عیسائی مصنفوں نے اسلام کی حقیقت اور رسول اللہ ﷺ کے اخلاق و کردار کو ظاہر کرنے میں جو دانستہ یا نادانستہ غلطیاں کی ہیں۔ اور سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' نے جب انگریزوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا کیا کہ اس کتاب نے اسلام کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کی ہیں۔ کسی دوسری کتاب نے اس طرح کی جانکاری نہیں دی ہے۔ سر ولیم میور کی یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس

کتاب کے مطالعے سے انگریزی تعلیم یافتہ مسلم نوجوان بھی اسلام کی طرف سے شک میں پڑنے لگے تو سرسید نے ''لائف آف محمدؐ'' میں سرولیم میور کے ذریعے پیش کئے گئے غلط اطلاعات کو نمایاں کرنے اور اس کتاب کا جواب لکھنے کی ٹھان لی۔ اسی غرض سے انہوں نے لندن کا سفر بھی کیا۔ ان کی بے چینی اور جوش وخروش کو الطاف حسین حالی نے اپنی کتاب حیات جاوید میں اس طرح بیان کیا ہے:

''وہ جب کبھی اور کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھتے تھے اکثر سرولیم کی کتاب کا ذکر کرتے تھے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام پر یہ حملے ہو رہے ہیں۔ اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں'' ۱۲

اس کتاب کا جواب لکھنے کے لئے سرسید کو کافی جدوجہد کرنی پڑی۔ سرولیم میور کے ذریعے کئے گئے ہر اعتراض کا ایسا محققانہ جواب دیا ہے جس سے عیسائی اور دہریہ قسم کے لوگوں کا منہ بند ہو سکے اور مسلمان مطمئن ہو جائیں۔ انہیں تسلی ہو جائے۔ سرسید نے تمام اعتراضات کے جواب خود عیسائی علماء کے اقوال کی روشنی میں دیئے ہیں، انہیں کے اقوال سے اسلام سے متعلق عیسائیوں میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا ہے۔ ''لائف آف محمدؐ'' کے جواب کے لئے انہیں مختلف ممالک اور متعدد جگہوں کا سفر کرنا پڑا۔ طرح طرح کی دشواریاں اٹھانی پڑیں اور جو سخت محنت کرنی پڑی اس کا اندازہ سید مولوی مہدی علی خاں کے نام بھیجے گئے سرسید کے خط کے اس ٹکڑے سے کیا جا سکتا ہے:

''ان دنوں میں ذرا میرے دل کو سوزش ہے ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرت کے حال میں لکھی ہے، اس کو میں دیکھ رہا ہوں اس نے دل کو جلا دیا اور ان کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا۔ مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت ﷺ کے سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا۔ کتاب لکھ دی جائے، اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے'' ۱۳

کئی دنوں کی لگاتار محنت اور جدوجہد سے انہوں نے لائف آف محمد کے جواب میں

بارہ خطبے لکھے، انہیں خطبات کو ایک انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرا کر لندن ہی میں خطبات احمدیہ کے نام سے شائع کیا۔ اس کتاب کے شروع میں سرسید کا لکھا ہوا ۲۴ر صفحات پر مشتمل ایک مبسوط دیباچہ بھی ہے۔ جس میں انہوں نے مذہب، مذہب اسلام سے متعلق زبردست گفتگو کرنے کے بعد عیسائی علماء کا اسلام اور رسول اللہ ﷺ پر نازیبا اعتراضات کا مدلل اور محققانہ جواب لکھنے کی وجہ بھی بیان کی ہے۔ الخطبة الاولی فی جغرافية جزيرة العربة وامم العاربة والمستعربة، الخطبة الثانية فی مراسم العرب و عاداتهم قبل الاسلام، الخطبة الثالثة فی الادیان المختلفة التی كانت فی العرب قبل الاسلام، الخطبة الرابعة فی ان الاسلام رحمة للانسان وحبة لاديان الانبياء باوضح البرهان، الخطبة الخامسة فی حالات كتب المسلمين، الخطبة السادسة فی الروايات المرويات فی الاسلام، الخطبة السابعة فی القرآن وهو الهدی والفرقان، الخطبة الثامنة فی احوال بيت الله الحرام والسوانح التی مضت عليها قبل الاسلام، الخطبة التاسعة فی حسبه ونسبه عليه الصلوة والسلام، الخطبة العاشرة فی البشارة المذكورة فی التوراة والانجيل، الخطبة الحادی عشر فی حقيقة شق صدر وما هية المعراج اور الخطبة الثانی عشر فی ولادته وطفوليته عليه الصلوة والسلام۔ خطبات احمدیہ کے ان بارہ خطبات میں سرسید احمد خاں نے اسلام، مسلمانوں اور رسول اللہ ﷺ سے متعلق اٹھائے گئے تمام اعتراضات کا جواب تحقیق کرنے کے بعد دیا ہے۔ ہر خطبے کی شروعات قرآن کریم کی ایک آیت سے کی ہے اور ان میں قرآن اور حدیث کی معتبر کتابوں سے سر ولیم میور کا جواب دیا ہے، ان دلائل کو سرسید نے بڑی تحقیق وجستجو کے بعد پیش کیا ہے۔ انہوں نے بطور سند صرف صحیح حدیثوں کو پیش کیا ہے موضوع اور ضعیف حدیثوں کا سہارا نہیں لیا۔

اردو ادب اور ہندوستانی سماج میں سرسید احمد خاں کو کئی حیثیتیں حاصل ہیں۔ تاریخ

اور آثار کے موضوع پر ان کی معرکہ آرا تحقیقی کتاب آثار الصنادید کا نام لینا ہی ان کی جملہ خدمات کے اعتراف کے مترادف ہے۔ ان کی یہ تصنیف ڈیڑھ برس کی انتہائی محنت کا نتیجہ ہے۔ چار ابواب پر مشتمل یہ ناقابل فراموش کارنامہ انجام دینے کا خیال اس وقت پیدا ہوا جب وہ دہلی میں منصف تھے۔ اس کتاب کی تیاری میں انہوں نے سخت محنت اور دلچسپی سے کام لیا۔ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود تعطیل کے دنوں میں شہر کے باہر کی عمارتوں کی تحقیق و تفتیش کرنے کے لئے دہلی سے باہر نکل جایا کرتے تھے۔ عام طور پر ان کے ساتھ ان کے دوست مولانا امام بخش صہبائی ہوا کرتے تھے۔ ان کی جفاکشی اور لگن کو ڈاکٹر مشتاق احمد نے اس طرح تفصیل سے لکھا ہے:

"آخری سانس لے رہی مغلوں کی دہلی کے آثار قدیمہ کی تاریخ لکھنے کے درپے ہوئے تو دہلی کے قدیم کھنڈروں میں بھٹکتے پھرے، عمارتوں کے کتبوں کا چربہ اتارا اور ان کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کی ۔۔۔ قطب مینار کے بعض کتبے زیادہ بلند ہونے کے سبب نہیں پڑھے جا سکتے تھے۔ اور اس مرد خدا نے اپنی عمر کی پرواہ کئے بغیر ان کتبوں کو قریب سے پڑھا اور ان کا چربہ اتارا۔ سینکڑوں تاریخی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اور اپنی نادر تصنیف "آثار الصنادید" مکمل کر ڈالی" [۱۴]

دہلی سے باہر کی بہت سی عمارتیں ایسی تھیں، جو ٹوٹ پھوٹ کر تقریباً کھنڈر ہو گئی تھیں، ان عمارتوں کے کتبوں کا پڑھنا اور ان سے ضروری معلومات حاصل کرنا دشوار تھا۔ کچھ عمارتیں تو ایسی بھی تھیں، جن کے ضروری حصے معدوم ہو چکے تھے۔ اور جو حصے باقی تھے ان سے استفادہ کرنا مشکل تھا۔ لمبی و چوڑی عمارتوں کی پیمائش اور ان کے کتبوں کو من و عن اصل خط میں پیش کرنا، خستہ و بوسیدہ مکانوں کی تصویریں کھنچوانا اور تقریباً سوا سو عمارتوں کی تحقیق کرنا یہ سب سر سید احمد خاں کے ہی بس کی بات تھی انہوں نے آثار الصنادید کے لئے تن من دھن کو تج دیا، وہ خود کہتے ہیں:

"قطب صاحب کی لاٹھ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے پڑھے نہ جا سکتے تھے،

ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں، ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا لیا جاتا تھا۔ اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربہ اتارتا تھا، جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔'' ۱۵

آثار الصنادید اور سرسید کے بارے میں شیخ عطاء اللہ رقمطراز ہیں:

''سرسید نے حیرت انگیز محنت، اپنی حیثیت سے بڑھ کر لاگت اور علمی تفتیش و تحقیق کی بدولت پہلوں کے ان آثار کو ہمیشہ کی زندگی بخش دی۔'' ۱۶

الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

''سرسید کی آئندہ ترقیات کی گویا یہ پہلی سیڑھی تھی۔'' ۱۷

ڈاکٹر سید شاہ علی رطب اللسان ہیں:

''یہی وہ کتاب ہے جسے سرسید نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر تصنیف کیا تھا۔'' ۱۸

سرسید کی یہ تاریخی اور تحقیقی کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے جس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کے دو ایڈیشن انہیں کی زندگی میں شائع ہوئے۔ انگریزی اور فرانسیسی میں ان کے ترجمے بھی ہوئے، پہلا ایڈیشن ۲۱ر ستمبر ۱۸۴۶ء کو مکمل ہوا اور ۱۸۴۷ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ پہلے ایڈیشن میں جو کمیاں رہ گئی تھیں انہیں درست کر کے ازسرِ نو مرتب کیا اور یہ ۱۸۵۴ء میں چھپ کر تیار ہو گیا تھا۔ بدقسمتی سے اس کے تقریباً تمام نسخے غدر کی نذر ہو گئے۔ زیرِ نظر چوتھا ایڈیشن چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں دہلی شہر کے باہر کی عمارتوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ۱۳۰ر عمارتوں کا ذکر ہے۔ جو کہ ۲۴۲ر صفحات پر محیط ہے، دوسرے باب میں دلی کے قلعوں کے بننے اور شہروں کے آباد ہونے کا حال مذکور ہے، تیسرا باب بادشاہوں اور امیروں کی متفرق بنائی ہوئی عمارتوں کے لئے خاص ہے جب کہ چوتھے باب میں دہلی اور دہلی کے لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں دہلی کے ۱۱۸ر مشاہیر کا حال قلم بند کیا گیا ہے۔ جو کہ نہایت

جامع ہے۔ آخر میں غالب کی فارسی نثر میں تقریظ، مولانا امام بخش صہبائی کے فارسی نثر میں ریویو اور مولانا صدرالدین خاں بہادر کی منظوم فارسی تقریظ شامل ہے۔ آثار الصنادید میں جن لوگوں اور جن چیزوں کا تذکرہ سرسید نے کیا ہے اپنے لفظوں میں ان پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> ''اس نسخۂ دلکشا کو زیور اتمام سے آراستہ کرکر اس مناسبت سے کہ صنادید روزگار کے آثاراور اعیان مملکت ہند کے احوال واطوار پر مشتمل ہے۔'' ۱۹

تحقیق کے سلسلے میں ان کا یہ کام اتنا بلند ہے کہ اگر سرسید کے دوسرے کام نکال دیئے جائیں یا سرسید احمد خاں اس کے علاوہ دوسرے تحقیقی کام نہ کرتے تو بھی ان کی محققانہ عظمت میں ذرہ برابر کمی نہ آتی۔

حوالہ جات

۱ مقالات شبلی، مولانا شبلی نعمانی، معارف اعظم گڈھ، ۱۹۵۰ء، دوم، ص: ۵۷

۲ مقالات سرسید، پانزدہم، مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور، ص: ۱۴۱

۳ مقالات شبلی، دوم، ص: ۵۸

۴ حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، اکادمی پنجاب (ٹرسٹ)، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص: ۳۷۰

۵ حیات جاوید، ص: ۱۶۵

۶ تاریخ فیروز شاہی مشمولہ مقالات سرسید احمد خاں، مرتبہ محمد عبداللہ خاں خویشگی، نیشنل پرنٹرس کمپنی علی گڈھ، ۱۹۵۲ء، ص: ۵۰۹

۷ تاریخ فیروز شاہی مشمولہ مقالات سرسید احمد خاں، ص: ۵۱۰۔۵۱۱

۸ جلاء القلوب پر ریویو مشمولہ مقالات سرسید ہفتم، سرسید احمد خاں، مجلس ترقی ادب کلب روڈ، لاہور، ۱۸۷۸ء، ص:۳۲

۹ جلاء القلوب بذکر المحبوب مشمولہ مقالات سرسید ہفتم، ص:۷

۱۰ حیات جاوید، ص:۱۲۴

۱۱ دار المصنفین کی تاریخی خدمات، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۲ء، ص:۴۳

۱۲ حیات جاوید، ص:۴۹۱

۱۳ انتخاب مکاتیب سرسید، شبلی اور اقبال، مرتبہ شیخ عطاء اللہ، شیخ محمد نصیر الدین ہمایوں قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ، لاہور، ۱۹۵۸ء، ص:۵۷

۱۴ سرسید کی نثری خدمات، ڈاکٹر مشتاق احمد، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۳ء، ص:۶۷

۱۵ بحوالہ حیات جاوید، ص:۴۷۔۴۸

۱۶ انتخاب مکاتیب سرسید، شبلی اور اقبال، ص:۳۱

۱۷ حیات جاوید، ص:۴۸

۱۸ اردو میں سوانح نگاری، ڈاکٹر سید شاہ علی، انجمن پریس، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص:۱۴۷

۱۹ اردو دیباچہ آثار الصنادید طبع اول، ص:۲ (ب) بحوالہ سرسید کی نثری خدمات، ص:۶۷

محمد حسین آزاد

(۱۸۳۰ء۔۱۹۱۰ء)

غدر کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد سر سید احمد خاں کی تحریک نے جنم لیا۔ اسی تحریک سے مسلمانانِ ہند کی نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس تحریک سے مسلمانوں میں بیداری پیدا ہونی شروع ہوئی۔ سر سید نے تہذیبی نہج کی تحریک چلائی۔ کچھ لوگوں نے اسی نہج کی تحریک چلا کر سر سید کی مخالفت شروع کی۔ مولانا شبلی اسلاف کے تہذیبی اور تاریخی سرمائے کو یکجا کر رہے تھے۔ اکبرالٰہ آبادی نئی اقدار پر تنقید کر کے مسلمانوں کو ماضی کی یاد دلا کر ان کا مستقبل تابناک بنانا چاہتے تھے۔ اور مولوی محمد حسین آزاد ''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی'' کے مطابق نئی فکر اور نئے اقدار کو اختیار کرنے کی ترغیب دلاتے تھے۔ جبکہ مولانا الطاف حسین حالی مسلمانوں کو ان کے ماضی کی یاد دلا کر مستقبل میں حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتے تھے۔ سر سید احمد خاں، الطاف حسین حالی اور مولوی محمد حسین آزاد حالات سے سمجھوتے کے حق میں تھے۔

محمد حسین آزاد کا دائرہ عمل ادب و شعر تھا۔ اسی دائرے میں رہ کر انہوں نے نئے ادبی و شعری رجحانات کی نشاندہی کی۔ مولوی محمد حسین آزاد اپنی تقریر و تحریر اور اسلوب میں

ایک امتیازی مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے تحقیق، تنقید، تذکرہ نگاری، سوانح نگاری، انشاء پردازی اور نثر نگاری وغیرہ اس وقت کی جب لوگ ان کے نام سے ناواقف تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد تقریباً ایک سو چھوٹی بڑی کتابوں اور رسالوں کے مصنف ہیں۔ جو مختلف موضوعات اور فنون پر مشتمل ہیں۔ ان میں بعض مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کی غیر مطبوعہ کتابیں آج بھی مولانا آزاد کلکشن کے نام سے پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبریری میں موجود ہیں۔ ان کی کچھ تصنیفات ایسی ہیں جن میں انہوں نے تحقیقی رخ اختیار کیا ہے۔ اس وقت تحقیق کا کوئی خاص اصول اور اسلوب نہیں تھا۔ اس لیے ان کی تحریروں میں آج کا تحقیقی اسلوب نظر نہیں آتا ہے۔ بلکہ ان کی وہ کتابیں جن میں تحقیقی رجحانات پائے جاتے ہیں داستانوی انداز میں ہیں یہی وجہ ہے کہ دور حاضر کے بیشتر نقاد و محققین انہیں محقق ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کا با قاعدہ کوئی تحقیقی کام نہیں ہے جسے بیان کیا جائے اور دعوی کے ساتھ کہا جا سکے کہ یہ ان کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ ان کی وہ کتابیں جن میں کچھ تحقیقی عناصر پائے جاتے ہیں وہ آبِ حیات، سخندان فارس، نگارستان فارس اور کلام ذوق کی ترتیب دیوان ذوق ہیں۔

مولوی محمد حسین آزاد نے ذوق کے منتشر اور بکھرے ہوئے کلام کو یکجا کیا۔ اور اسے مرتب کر کے پیش کیا۔ کلام ذوق کی ترتیب میں انہوں نے خوب محنت کی۔ ان کے کلام کو ردیف کے اعتبار سے مرتب کیا۔ دیوانِ ذوق میں سب سے پہلے ذوق کے تفصیلی حالات کو بیان کیا ہے۔ پھر ردیف الف سے ردیف ی کی غزلوں کے علاوہ کچھ مزید غزلوں کو پیش کیا ہے۔ بعدہٗ بالترتیب قطعات، رباعیات، ایک مثنوی اور چوبیس قصائد کے علاوہ مزید قصیدے، قطعات اور رباعیات کے اشعار ہیں۔ دیوانِ ذوق میں مولانا محمد حسین آزاد جگہ جگہ ذوق کے اشعار، ان کی غزلوں اور قصیدوں وغیرہ پر تبصرے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے بنت آغا محمد ابراہیم کی فرمائش پر اسے مرتب کیا۔ جو کہ علیمی پرنٹنگ ورکس دہلی سے ۱۹۳۳ء میں طبع ہوا۔

ذوق کے کلام کی ترتیب سے متعلق دیوان ذوق کے دیباچہ میں مولانا محمد حسین آزاد رقمطراز ہیں:

''ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں، صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس کچھ لکھے تھے۔ دیوان مروجہ میں کچھ چھپے اور ان کی زبان سے کبھی کچھ سنے، کبھی کچھ سنے، پھٹے پرانے مسودے لڑکپن سے بڑھاپے تک کی یادگار ہیں۔ والد مرحوم کے ہاتھ کی بہت تحریریں ہیں، بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں کہ حاضر و غائب لکھتا اور جمع کرتا تھا۔ کٹے پھٹے اشعار کا پڑھنا، جٹے حرفوں کا اجالنا، اس زمانے کے خیالات کو سمیٹنا، حالتوں کا تصور باندھنا، بھولے بسرے الفاظ ومطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا میرا کام نہ تھا۔ خدا کی مدد اور پاک روحوں کی برکت شامل حال تھی۔ میں حاضر اور خدا ناظر تھا، راتیں صبح ہو گیئں اور دن اندھیرے ہو گئے۔ جب یہ مہم سرانجام ہوئی،،[۱]

انہوں نے ایران کا سفر اختیار کیا اور فارسی شعر وادب سے متعلق سخندان فارس اور نگارستان فارس لکھی۔ ان کی کتاب سخندان فارس دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ لسانیات سے متعلق ہے جبکہ اس کتاب کے دوسرے حصے میں ان کے دئے گئے لکچرس ہیں۔ سخندان فارس میں فیلا لوجی کے فن (زبانوں کی فلسفی تحقیقات) کو بیان کر کے ہندوستانیوں کو نیا راستہ دکھایا ہے۔ انہوں نے فارسی زبان کی تحقیق وتدقیق کے لئے ایران کا سفر کیا۔ اس کام کیلئے خوب محنت اور جدوجہد کی۔ وہاں کے مؤبدوں سے ملاقات کی اور زبان فارسی کی جداگانہ طریقے سے چھان بین کی۔ وہاں کے رسوم ورواج دیکھے، ایرانی محاورات کی چھان پھٹک بھی خوب کی، اردو اور فارسی، قدیم فارسی اور قدیم سنسکرت کے لسانی رشتوں پر زور دیا، اس کے علاوہ فارسی کے مشہور شعراء کی سوانح عمری نگارستان فارس میں لکھی۔ نگارستان فارس جو کہ مولانا محمد حسین آزاد کا ایک تذکرہ ہے، اس میں ابو عبداللہ محمد رودکی سے لے کر نورالعین واقف بٹالوی تک ۳۵ فارسی شعراء کے حالات بالتفصیل پیش کئے گئے ہیں۔ اور ان کے کلام پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ ان کی یہ دونوں کتابیں سفر ایران سے جڑی ہوئی ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد کا سب سے اہم کارنامہ ''آب حیات'' ہے۔ جو پندرہ سال میں پائے تکمیل کو پہونچی، ان کی معرکتہ الآرا تصنیف آب حیات نے اردو کو تنقیدی شعور اور تحقیقی بصیرت سے روشناس کرایا۔ آب حیات قدیم تذکرہ نگاری اور جدید ادبی تاریخ نویسی کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت رکھتی ہے۔ محمد حسین آزاد نے اس کے مواد اور دیگر تفصیلات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ کتاب تذکروں کے اثر کے باوجود ادبی تاریخ کے زمرے میں آجاتی ہے۔ انہوں نے اردو شعراء کو پانچ مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ہر دور کی فنی ولسانی خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔ ہر دور کے شعراء کی سوانح اور شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ آب حیات کئی خصوصیات کی حامل ہے، آب حیات نے محمد حسین آزاد کو نقاد، محقق، تذکرہ نگار، سوانح نگار، تاریخ نویس اور انشاء پرداز بنادیا۔ محمد حسین آزاد کے محقق ہونے کے سلسلے میں لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب، قاضی عبدالودود اور احتشام حسین مولانا محمد حسین آزاد کو محقق تسلیم کرتے ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب فیض میر کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''حضرت آزاد نے آب حیات میں معلومات کا وہ انبار لگا دیا ہے، جو تنگ نگاہوں میں سمانہیں سکتا اور ان کی تحقیق کی وسعت اور جامعیت کا یقین کرنے سے زیادہ آسان یہ معلوم ہونے لگا ہے کہ ان کے اکثر بیانوں کا من گھڑت افسانوں میں شمار کرلیا جائے ۔۔۔ آزاد کی تحقیق میں غلطیاں ممکن ہیں اور کسی محقق کو غلطیوں سے مفر نہیں ۔لیکن جو لوگ تحقیق کی غلطی اور افسانے کی تصنیف کا فرق سمجھتے ہیں ان کی نظر میں آزاد محقق ہی ٹھہرتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آزاد تحقیق کو افسانے سے زیادہ دلچسپ بنا سکتے ہیں۔'' ۲

قاضی عبدالودود اپنے ایک مقالہ محمد حسین آزاد بحیثیت محقق میں رقمطراز ہیں:

''اکثریت آزاد کی نثاری کی معترف ہے مگر یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ وہ تحقیق کے مردِ میداں تھے۔ اولیت مصر ہے کہ وہ صرف ایک بڑے انشاء پرداز ہی نہیں ایک بڑے

محقق بھی تھے۔''

مولانا شبلی نعمانی مولوی محمد حسین آزاد سے متعلق لکھتے ہیں:

''میں جانتا ہوں کہ وہ تحقیق کے میدان کے مرد نہیں، لیکن ادھر ادھر کی گپیں بھی ہانک دیتا ہے۔تو وحی معلوم ہوتی ہے''۔ ۳۳

محمد حسین آزاد کی تحریریں افسانے کی رنگ میں ہوتی ہیں۔ اگر ان کی تحریروں کا جائزہ لیا جائے یا صرف ان کی معرکتہ آرا تصنیف ''آبِ حیات'' پر تحقیقی نظر ڈالی جائے تو یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ اس کتاب میں ان کی پندرہ سال کی محنت شاقہ اور جدو جہد نے نقاد و محققین کو ایک نیا راستہ دکھایا ہے۔ اس کتاب میں جہاں بہت ساری خوبیاں ہیں وہیں کچھ خامیاں بھی ہیں۔ قاضی عبدالودود نے آبِ حیات کی تحقیقی خامیوں اور کمزوریوں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

قاضی عبدالودود کی نظر میں محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں کوئی بھی بات بنا چھان بین کے نہیں لکھی ہے اور اگر کہیں لکھی ہے تو اس بات کا احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ یہ حقیقت پر مبنی ہے یا محض قیاس آرائی ہے۔

آبِ حیات کی تحقیقی خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود اس کتاب سے کسی بھی محقق یا ناقد کو مفر نہیں۔ قاضی محمد خالد اقبال صدیقی آبِ حیات سے متعلق لکھتے ہیں:

''شعراء کے کلام پر کچھ کہنے یا لکھنے اور تنقیدی رائے دیتے وقت اسے ہر مصنف، محقق یا ناقد کو مولانا کے تحریر کردہ تنقیدی جملوں کی بیساکھیوں کے سہارے ہی آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا یا اس سے اجتناب و انحراف کرتا ہے تو اس کی تحقیق مستند نہیں مانی جاتی ۔ اس کے شواہد کی کوئی دلیل نہیں ہوتی ۔ اس کی تنقید مبنی بر حقائق نہیں ہوتی''۔ ۳۴

حوالہ جات

۱۔ دیوان ذوق، مرتبہ مولوی محمد حسین آزاد، علیمی پرنٹنگ ورکس، دہلی، ۱۹۳۳ء، ص:۱

۲۔ فیض میر، مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب، نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ، لکھنو، بار دوم، ۱۹۶۴ء، ص:۱۔۲

۳۔ محمد حسین آزاد کی تنقید نگاری، قاضی محمد خالد اقبال صدیقی، بھوپال بک ہاؤس، بھوپال، ۱۹۸۹ء، ص: ۲۱

۴۔ محمد حسین آزاد کی تنقید نگاری، ص:۲۱۔۲۲

مولانا الطاف حسین حالی

(۱۸۳۷ء۔۱۹۱۴ء)

مولانا الطاف حسین حالی کو بچپن ہی میں تحصیل علم کا شوق پیدا ہوا اور یہ شوق آخری ایام تک باقی رہا۔ دہلی میں قیام کے دوران مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ سے اکثر ان کی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ حالی ان ملاقتوں سے فیض یاب بھی ہوتے تھے۔ شاعری کا اعلیٰ درجہ کا ذوق رکھنے والے شیفتہ سے بھی ان کی ملاقات تھی۔ حالی شاعری میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور مرزا غالب سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ اس سلسلے میں حالی خود کہتے ہیں۔

''انہیں (شیفتہ) کے ساتھ میں بھی اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا۔ وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے پیدا ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے۔ اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا۔ اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ، محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے''۔[۱]

حالی سرسید احمد خاں سے بے حد متاثر تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو ان کا ماضی یاد

دلا کر مستقبل میں حالات سے سمجھوتہ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ حالات سے سمجھوتے کے معاملے میں حالی سرسید کے نظریئے سے اتفاق اور اس کی تائید کرتے ہیں۔ انہوں نے سرسید کی فرمائش پر ۱۸۷۹ء میں مسدس مدو جزر اسلام لکھی اور اسی مسدس کے ذریعہ حالی نے مسلمانوں کی سوئی ہوئی جماعت میں بیداری پیدا کر دی۔ حالی اردو دنیا میں کئی حیثیتوں سے متعارف ہیں۔ نظم و نثر میں ان کی تصانیف کی تعداد ۵۳ر ہے۔ ان کی اہم تصانیف حیاتِ جاوید، یادگار غالب، حیات سعدی، مقدمہ شعر و شاعری اور مسدس مدو جزر اسلام ہیں۔ ان تصانیف میں حالی بہ حیثیت سوانح نگار، تنقید نگار اور شاعر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ انہوں نے باقاعدہ کوئی تحقیق نہیں کی ہے بلکہ ان کی تحریروں میں مبالغہ سے گریز، واقعات کی چھان بین اور حقائق پیش کرنے کے لئے جدو جہد نظر آتی ہے جو کہ تحقیق کا تقاضہ ہے۔ ان کی تحریروں اور تصانیف میں تحقیقی رجحان ملتا ہے۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں کچھ مذہبی مناظروں اور کچھ اخلاقی اصلاح کی طرف رجحان ملتا ہے۔ اردو ادب میں حالی یادگار غالب، حیاتِ جاوید، مقدمہ شعر و شاعری اور جدید نظم میں راستہ ہموار کرنے کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔

شیخ سعدی کو جو مقبولیت ایران میں حاصل تھی وہی مقبولیت ہندوستانی مسلمانوں میں تھی۔ ایران و ہند میں اس قدر مقبولیت کے باوجود شیخ سعدی کے حالات زندگی اردو اور فارسی ادب میں گم نامی میں تھے۔ حیات سعدی سے قبل کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جو شیخ سعدی کے حالات پر مشتمل ہو اور اسے بطور سند پیش کیا جا سکے۔ حالی نے شیخ سعدی کے حالات زندگی کو پیش کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ کمزور روایات، فرضی قصوں کی کثرت اور مواد کی کمی کے باعث سعدی کے حالات زندگی کو یکجا کرنا اور انہیں ترتیب دینا مشکل کیا مشکل ترین کام تھا۔ اتنا مشکل اور کٹھن کام حالی نے نامکمل تذکروں اور کلام سعدی کی مدد سے حیات سعدی کے نام سے پورا کیا۔ حالی نے صحیح واقعات کو معلوم کرنے کے بعد ان سے خاطر خواہ نتائج نکالے۔ مولوی عبدالحقؒ لکھتے ہیں:

''مصنف کو شہد کی مکھی کی طرح چن چن کر واقعات کو یکجا کرنا پڑے۔ حالی نے صرف واقعات کا انتخاب ہی نہیں کیا بلکہ اسے ظرافت کی چاشنی سے دلچسپ بھی بنایا اور ایک فارسی شاعر کی سائنٹیفک سوانح و تنقید کی بنا ڈالی ہے۔ جس کا نمونہ فارسی شاعری میں بھی نہیں تھا۔'' ۲

حیات سعدی قدیم تذکروں کی فرضی اور من گھڑت روایات کی تردید کرتی ہے۔ ساتھ ہی شیخ سعدی کے کلام کا اچھا تجزیہ بھی پیش کرتی ہے۔ علامہ شبلی کے مطابق:

''یہ (حیات سعدی) سعدی کی محققانہ سوانح عمری ہے اور قدیم تذکرہ نویسی کے مقابلے میں فن بایوگرافی میں ایک نیا راستہ دکھاتی ہے۔'' ۳

حالی نے پہلی مرتبہ اردو زبان میں شیخ سعدی کو ایک انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور بہت سی روایات کو غلط قرار دیا ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں زیادہ تر سعدی کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انہوں نے سعدی کے کلام پر بہت تفصیلی بحث کی ہے۔ جس کی بنا پر یہ کتاب سوانح کم ادبی تنقید زیادہ نظر آتی ہے۔ تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے اس کتاب میں سعدی کی شخصیت اور کلام کا ایک عمدہ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالرزاق کانپوری لکھتے ہیں:

''اس کتاب کو سامنے رکھ کر شعرالعجم کی تصنیف کی گئی۔'' ۴

مولانا حالی نے یادگار غالب میں اپنے استاد غالب کی مبسوط سوانح عمری پیش کی ہے۔ یادگار غالب لکھ کر انہوں نے غالب کی شاعری کی عظمت عام کر دی۔ جس سے غالب فہمی کا سلسلہ شروع ہوا اور غالب سے دلچسپی بڑھی۔ مطالعہ غالب میں اس کتاب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یادگار غالب میں انہوں نے غالب کی سوانح پر کم اور ان کی انشاء پردازی اور شاعری پر زیادہ توجہ کی ہے۔ اس کتاب کا ایک تہائی حصہ غالب کی سوانح پر مشتمل ہے۔ مگر یادگار غالب میں غالب کی زندگی کے بعض پہلو کم روشن اور شخصیت کا خاکہ دھندلا اور نامکمل نظر آتا ہے۔ اس میں حالی نے غالب کے خطوط اور کچھ دوستوں کے

بیانات پر اکتفا کیا ہے۔ کچھ واقعات کو ادھورا اور کچھ کو مصلحتاً خارج کر دیا ہے۔ جب کہ اس کا دو تہائی حصہ غالب کی نظم و نثر کے تجزیہ سے متعلق ہے اس حصے میں اردو فارسی نظم و نثر پر تجزیہ اور دوسرے شعراء سے موازنہ کیا گیا ہے۔اس کتاب میں حالی نے مرزا غالب کی شاعرانہ عظمت کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس وجہ سے واقعات کی ترتیب میں چھان بین اور سوانحی حصے پر کم توجہ دی ہے۔ اس میں بہت سے سرسری بیان اور کچھ تحقیقی خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ جو دوسرے سوانح نگاروں کے لئے حصول مواد میں دقت پیدا کرتی ہیں۔ یادگار غالب نے لوگوں میں غالب شناسی کا رجحان پیدا کیا۔

اس صدی کی تحقیقی نظر زیادہ وسیع اور پختہ ہے۔ حالی کے عہد میں تحقیقی نظر اس قدر پختہ نہیں تھی۔ اس لئے یادگار غالب آج کے تحقیقی معیار پر پوری نہیں اترتی۔ یادگار غالب انیسویں صدی کی تخلیق ہے۔اس کتاب میں پائے جانے والے تحقیقی نقائص حالی کے کمال فن پر دھبہ نہیں ہیں۔ حالی پہلے شخص ہیں جنہوں نے بڑی خوبصورتی سے غالب کی صلاحیتوں اور شعری خصوصیات کو عوام کے سامنے پیش کیا ہے۔اس کتاب سے غالب کی شاعرانہ عظمت کو لوگوں سے متعارف کرانا تھا۔ حالی اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔ ہاں یادگارِ غالب کا سوانحی حصہ ضرور ناقص ہے۔ حالی اس کتاب میں صحت مند روایت قائم کر کے اچھی سوانح عمری پیش کرنا چاہتے تھے۔لیکن اس میں تفصیلات اور تحقیق کی کمی ضرور کچھ ہے۔ تحقیقی خامیوں کے باوجود یادگار غالب اپنی دل کشی، دل چسپی اور غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہے اس کتاب کے بارے میں مولانا شبلی رقم کرتے ہیں:

''یادگار غالب کے بعد غالب پر کسی اور کتاب کی کیا ضرورت تھی۔'' (شبلی کے ایک خط سے اقتباس)

غالب پر لکھی گئی کوئی ایسی کتاب نہیں جس میں یادگار غالب سے مدد نہ لی گئی ہو۔ غالب، آثارِ غالب، ذکرِ غالب اور احوالِ غالب کے مصنفین اور مرتبین نے یادگار غالب

سے استفادہ کیا ہے۔ یہی یادگار غالب کی اہمیت کی سب سے بڑی دلیل ہے، یہ کتاب تحقیقی کم، تنقیدی اور سوانحی زیادہ ہے۔ حالی کے اس یادگار کارنامے کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

مولانا حالی نے تین عظیم شخصیتوں شیخ سعدی، مرزا غالب اور سر سید احمد خاں کی سوانح کو قلم بند کیا ہے۔ سر سید پر ان کی لکھی گئی سوانحی کتاب حیات جاوید کے نام سے خاص وعام میں معروف ہے۔ مولانا حالی نے اس کتاب میں سر سید احمد خاں کی ابتدائی زندگی، ان کے تعلقات، ان کے احباب، ان کی تصانیف، اصلاحی، سماجی اور مذہبی کارناموں کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ سر سید کے تعلیمی لائحہ عمل کے مکمل نقوش اس کتاب میں بیان کئے گئے ہیں۔ حیات جاوید ایک دیباچہ کے ساتھ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں دو ابواب ہیں۔ جن میں سر سید کے خاندانی حالات، ابتدائی واقعات اور ملازمت کے علاوہ ان کی دیگر دلچسپیوں کا ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں سر سید کے مذہبی عقائد اور مذہبی تحریکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی مذہب کو ان کی تمام تحریکوں کا محرک قرار دیا گیا ہے۔ سر سید احمد خاں پر لکھی گئی یہ سوانحی کتاب مغربی طرز پر ہے۔ اس کتاب میں حالی نے مغربی طرز پر سیرت نگاری کا ایسا نمونہ پیش کیا ہے جو ان سے قبل اردو زبان وادب میں موجود نہ تھا۔ چھ سال کی تلاش وجستجو اور تحقیق و چھان بین کے بعد حیات جاوید لکھی۔ سر سید احمد خاں نے تقریباً چالیس برس تک تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا۔ تقلید کی جڑ کاٹی، مذہبی پیشواؤں سے اختلاف کیا۔ مذہب اسلام کے بارے میں اپنے نظریات پیش کئے۔ پرانی روش چھوڑنے کی تلقین کی۔ جس کی بنا پر ان کی سخت مخالفت کی گئی۔ انہیں کافر وملحد کہا گیا۔ کئی جگہوں سے کفر کے فتوے منگائے گئے۔ سر سید احمد خاں کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ وہ اپنے دور کے عظیم انسان تھے۔ انہوں نے قوم کی اصلاح کی۔ حالی کو سر سید سے عقیدت تھی۔ اس کتاب میں جا بجا عقیدت کا رنگ گہرا نظر آتا ہے۔ باوجود گہری عقیدت کے حالی نے سر سید کے تسامحات کی گرفت کی۔ حیاتِ جاوید میں سر سید کی تفسیر

القرآن میں ہوئی لغزش کی طرف حالی اس طرح اشارہ کرتے ہیں:

''سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں۔'' ۵

اس کے علاوہ حالی نے سرسید سے ذاتی عقیدت کے باوجود شدید اختلاف کیا ہے انہوں نے سرسید کے اندر پائی جانے والی خامیوں کو بیان کیا ہے۔ مولانا حالی میں سیرت نگاری کی خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں جو حیاتِ جاوید میں نظر آتی ہیں۔ سرسید قوم کی اصلاح کے خواہش مند تھے اور حالی بھی قوم کی اصلاح چاہتے تھے۔ یہ دونوں حضرات قوم کو گمراہی کے عمیق غار سے نکالنا چاہتے تھے، مولانا شبلی ان دونوں شخصیات سے بہت متاثر ہیں۔ چنانچہ سرسید، حالی اور حیات جاوید کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ایک شریف انسان نے ایک شریف تر انسان کی داستان حیات لکھی اور آشنائے فن ہوکر لکھی'' ٦

مولانا حالی نے سرسید کی ایماء پر قوم کی اصلاح کے لئے مسدس مدو جزر اسلام لکھی جو کہ ایک شاہکار کارنامہ ہے۔ سرسید کی تحریک کے بعد ہی حالی نے مسدس مدو جزر اسلام لکھی۔ جس میں اسلاف کی شان عظمت اور بلند مقام اور حال کی پستی وذلت کا تذکرہ کرکے مستقبل اچھا بنانے کی ترغیب دی ہے۔ سرسید احمد خاں کے مشن کو اس مسدس نے بہت تقویت پہونچائی ہے۔ اس مسدس کے ذریعے حالی نے قوم کو جھنجھوڑ دیا۔ خواب غفلت میں پڑے لوگوں کو بیدار کر دیا۔ صالحہ عابد حسین اپنے مقالہ ''حالی کا تعلق سرسید وعلی گڑھ سے'' میں لکھتی ہیں:

''حالی قدرت کی طرف سے وہ صلاحیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے جو کسی مصلح میں ہونی چاہئیں اور ان کے قلم میں خدا نے وہ تاثیر دی تھی جو خواب غفلت میں سرشار قوم کو بیدار کرنے کا کارنامہ انجام دے سکے۔'' ۷

مولانا حالی اردو میں جدید طرز کی سوانح عمریوں کے موجد ہیں۔ انہوں نے حیاتِ

جاوید، حیاتِ سعدی اور یادگار غالب ایک خاص نقطۂ نظر کے تحت لکھی ہیں۔ جو کہ ایک بلند معیار کے لئے راستہ ہموار کرتی ہیں اس فن میں حالی کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔

مولانا حالی نے اپنے شعری مجموعہ کے لئے طویل مقدمہ بڑی محنت اور تحقیق و تدقیق سے لکھا ہے۔ جو مقدمہ شعر و شاعری کے نام سے معروف ہے، یہ مقدمہ دیوان کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ مقدمہ شعر و شاعری اپنے عہد کے لحاظ سے ایک انقلابی کارنامہ تھا۔ اس کا شمار اردو کی ان اہم کتابوں میں ہوتا ہے جن کی اہمیت و افادیت پر کبھی آنچ نہیں آئی۔ یہ اردو میں تنقید کی پہلی کتاب ہے۔ اس نے عام لوگوں کی توجہ شاعری کے ساتھ شاعری کے بعض اہم مسائل کی طرف مبذول کرائی۔ حالی نے گارساں دتاسی، سرسید اور ان کا رسالہ تہذیب الاخلاق ، ان کی تحریک ، غدر اور اس کے اثرات ، لاہور کے جدید طرز کے مشاعروں اور قدیم اصول تنقید سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے یہاں قدیم و جدید نظریات کا آپس میں گھل مل کر ایک نیا نظریہ دکھائی دیتا ہے۔ ان کے دیوان میں قدیم و جدید دونوں رنگ کا کلام شامل تھا۔ اس دیوان کے مقدمہ (جو کتابی شکل میں مقدمہ شعر و شاعری ہے) میں شاعری کے حسن و قبح، شعر کی تاثیر، اس کی عظمت، اچھی شاعری اور بری شاعری کے نقصانات وفوائد، اس کے مقاصد، شعر کی ماہیت، غزل کے معائب، نیچرل شاعری، غزل، قصیدے، مرثیے، مثنویاں نیز تخیل، مطالعۂ کائنات، تفحص الفاظ، اصلیت، جوش اور سادگی وغیرہ کا تفصیلی بیان اور آمد و آورد میں فرق واضح کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مقدمہ میں اردو شاعری سے متعلق دیگر معلومات فراہم کی ہیں۔ مولانا حالی اور ان کے زندۂ جاوید کارنامہ مقدمہ شعر و شاعری کے بارے میں ڈاکٹر عبدالقیوم کا یہ اقتباس لائق دید ہے:

> ''اردو میں باقاعدہ تنقید کا آغاز مولانا حالی کے مقدمے سے ہوتا ہے۔ جو دیوان کے ساتھ ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں پہلی بار شاعری کی ماہیت پر بحث کی گئی۔ اور بہت سے سوالات اٹھائے گئے اور ان کے جوابات بھی دیئے گئے۔ اس سے تنقیدی بحث کا آغاز ہوا اور شاعری اور اس کے مقاصد کی وضاحت میں بڑی مدد ملی اور تنقیدی

نظریات و تصورات ایک واضح صورت میں سامنے آئے۔ اردو تنقید کی دنیا میں مقدمے کو تنقید کا پہلا صحیفہ قرار دیا گیا۔'' ۸؎

حالی نے اس کتاب میں تمام نظریات کو مدلل اور عالمانہ و محققانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ اپنے نظریات کو بہت ہی خوبصورت طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر نیچرل شاعری کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

'' نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معنیً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو۔ لفظاً نیچر کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تا بہ مقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو جس میں وہ شعر کہا گیا ہے۔۔۔ معنیً نیچر کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئے۔ پس جس شعر کا مضمون اس کے خلاف ہوگا، وہ ان نیچرل ہوگا'' ۹؎

حوالہ جات

۱۔ مطالعہ حالی، شجاعت علی سندیلوی و ناظر کاکوروی، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۵۶ء، ص:۱۱۔۱۲

۲۔ الطاف حسین حالی، ہماری زبان، ۱۶رجون، ۱۹۴۹ء، بحوالہ حالی کی اردو نثر نگاری، ص:۱۲۶

۳۔ بحوالہ حالی کی اردو نثر نگاری، ڈاکٹر عبد القیوم، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص: ۱۲۸

۴۔ یادایام، محمد عبدالرزاق کانپوری، عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد، دکن، ص: ۹۹

۵۔ حیات جاوید، الطاف حسین حالی، اکادمی پنجاب (ٹرسٹ) لاہور، مارچ ۱۹۷۶ء، ص:۲۰۴

۶۔ بحوالہ مطالعہ حالی، ص: ۹۵

۷۔ ادبی جھلکیاں، صالحہ عابد حسین، ادارہ انیس اردو، الہ آباد، جون ۱۹۵۹ء، ص: ۶۲۔۶۳

۸۔ حالی کی اردو نثر نگاری، ص: ۳۳۲

۹۔ مقدمہ شعر و شاعری، مولانا الطاف حسین حالی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص:۱۰۲

مولانا شبلی نعمانی

(جون ۱۸۵۷ء - ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء)

ان کی تعلیم کا سلسلہ اصلاً اس وقت شروع ہوا جب وہ مولانا فاروق چریا کوٹی کی خدمت میں عربی علوم سیکھنے کے لئے حاضر ہوئے۔ درسیات کی تکمیل کے بعد ادب، فقہ اور حدیث وغیرہ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے رامپور، سہارنپور، لکھنؤ اور لاہور کا سفر اختیار کیا۔

شبلی جب اپنے چھوٹے بھائی سے ملنے کے لئے علی گڑھ گئے تو وہاں سرسید سے بھی ملاقات ہوئی۔ سرسید شبلی کی ذہانت اور علمی لیاقت سے بے حد متاثر تھے۔ سرسید کے کہنے پر شبلی نے علی گڑھ میں ملازمت کرلی۔ علی گڑھ میں رہ کر شبلی نے بہت کچھ سیکھا۔

شبلی ایک عالم، مفکر، مؤرخ، ادیب اور ناقد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی ولادت ایک خوشحال زمیندار گھرانے میں مئی ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ کے ایک معروف قصبہ بندول میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مولوی شکر اللہ سے حاصل کرنے کے بعد شبلی نے عدالت میں نقل نویسی سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ انہیں اس ملازمت سے طبعی مناسبت نہیں تھی۔ اسی زمانے میں شبلی شعروشاعری کررہے تھے۔ شبلی عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے عالم ہیں۔

ان کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے بہت سی تصانیف چھوڑی ہیں اور مختلف اصناف پر قلم جنبانی کی ہے۔ انہوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ اردو میں ان کی شاعری اخلاقی، سماجی اور سیاسی اصلاح کی تلقین کرتی ہے۔ ۱۸۸۵ء میں انہوں نے مثنوی ''صبح امید'' لکھی۔ یہ مثنوی قوم کے تنزل کا مرثیہ ہے ۔ اس مثنوی میں حال اور مستقبل دونوں عہد کی بات کی گئی ہے۔ اس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کو پُر درد انداز میں بیان کرنے کے بعد سرسید کے ذریعہ شروع کی گئی تحریک پر ایک نئی صبح کی آمد کی خبر سنائی گئی ہے۔ اس کا شمار اردو کی بہترین نظموں میں ہوتا ہے۔ اس مثنوی کو علی گڑھ میں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔

ان کا ابتدائی اردو کلام معمولی مگر فارسی کلام زبردست ہے۔ شبلی کے اردو کلام کا مجموعہ ''کلیات شبلی'' کے نام سے شائع ہوا، جبکہ فارسی کلام ''دیوان شبلی'' کے نام سے منظر عام پر آیا، جدید اردو شاعری کی بنیاد گرچہ مولانا حالی اور محمد حسین آزاد نے ڈالی مگر ہندوستان میں فارسی زبان میں نئی شاعری کی بنیاد مولانا شبلی کے ہاتھوں ڈالی گئی۔ فارسی شاعری میں انہوں نے نئے خیالات، قومی احساسات اور مذہبی جذبات، زبان کی چاشنی اور محاوروں کی صحت کو اس طرح داخل کیا کہ مسلمانوں کی قومی زندگی کے لئے یہ چیز آب حیات بن گئی۔ انہوں نے دیوان شبلی، کلیات شبلی، دستۂ گل اور مثنوی صبح امید میں غزل، مثنوی، قصیدہ، قطعہ اور نظم نگاری کا نمونہ پیش کیا ہے۔

دراصل ان کی طالب علمی کا دوسرا دور علی گڑھ میں شروع ہوا۔ علی گڑھ ہی میں انہیں سرسید اور ان کی لائبریری کے علاوہ پروفیسر آرنلڈ جیسے علم دوست انسان سے استفادہ کا موقع ملا۔ انہوں نے آرنلڈ سے فرنچ زبان سیکھی اور ان کو عربی زبان سکھائی۔

علی گڑھ پہنچنے کے بعد انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس ہوا۔ اسی مقصد کے تحت اعظم گڑھ میں ''نیشنل اسکول'' کے نام سے ایک انگریزی مدرسہ قائم کیا۔ انہیں کی کوششوں کی بدولت ۱۹۰۳ء میں ندوہ میں انگریزی بحیثیت ایک مضمون پڑھائی جانے لگی۔ علی گڑھ

پہنچنے کے بعد ان کے اندر تاریخی اور تصنیفی ذوق پیدا ہوا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کو اپنا ماضی اور حال تاریک نظر آرہا ہے اور مسلمان ذہنی طور پر منتشر اور ان کے عقائد نئے مغربی تصورات کے سامنے متزلزل ہیں تو انہوں نے المامون، سیرت النعمان، الفارق، الغزالی اور سیرت النبی جیسی کتابیں لکھیں اور ۱۸۸۷ء میں ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' پر ایک جامع مقالہ لکھا۔ ان کتابوں میں اور اس مقالے میں مسلمانوں کی ولولہ انگیز تاریخ بیان کر کے اس پر فخر کیا گیا ہے۔

شبلی کا کہنا ہے کہ کسی واقعے کو صرف اس لئے درست نہیں مان لینا چاہئے کہ وہ کسی خاص کتاب میں درج ہے بلکہ اس واقعے کی صحت وصداقت کے لئے دلائل اور استدلال کے ذریعہ تحقیق کرنی چاہئے۔ اپنی کتابوں کی تالیف کے وقت شبلی ان باتوں کا خیال رکھتے تھے۔

شبلی ایک ممتاز سوانح نگار کی حیثیت سے علمی وادبی حلقہ میں پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے کئی عظیم شخصیتوں پر بڑی تحقیق وتدقیق کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ ان کی اہم سوانحی تصانیف المامون، سیرۃ النعمان، الغزالی اور سوانح مولانا روم ہیں۔ ''المامون'' کو شبلی نے دوحصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جس میں مامون کی ولادت، تعلیم وتربیت، ملک کی اندرونی جنگیں اور متعدد فتوحات کے ساتھ مامون کے اخلاق وعادات کا تفصیلی بیان ہے۔ اس کتاب کو تاریخ بنی العباس کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے، انہوں نے اس کتاب میں قصوں اور حکایتوں کو چھان بین کر کے بڑے دل چسپ انداز میں بیان کیا ہے، مامون الرشید شبلی کی پسندیدہ شخصیت ہیں، اس کے باوجود شبلی نے ان کی خوبیوں کے ساتھ خامیوں اور کمزوریوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

سیرۃ النعمان امام ابوحنیفہ کی صرف سوانح عمری ہی نہیں بلکہ ان کے شاگردوں کے بارے میں کافی معلومات فراہم کرتی ہے۔ دوحصوں پر مشتمل امام ابوحنیفہ کی یہ سوانح عمری دراصل مولانا شبلی کے ذوق وشوق کا دوسرا نام ہے۔ کیونکہ وہ حنفی المسلک کے سخت

پیروکار تھے۔شبلی تاریخ وسوانح نگاری میں مہارت رکھتے تھے۔اس تصنیف میں واقعات کی چھان بین اور کھرے کھوٹے کا خاص خیال رکھا گیا ہے، ساتھ ہی اس میں امام ابوحنیفہ کے شاگردوں کا مفصل ذکر ہے۔

حضرت عمر فاروق تاریخ اسلام ہی نہیں بلکہ تاریخ عالم کی عظیم شخصیت پر لکھی گئی ان کی سوانحی کتاب ''الفاروق'' میں حضرت عمر فاروقؓ کے اخلاق و عادات اور شجاعت و دیانتداری کا بخوبی ذکر کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ آپ کے سیاسی افکار وانتظام اور ملکی نظام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔یہ سوانحی کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔پہلا حصہ تمہید کے علاوہ حضرت عمر فاروقؓ کی پیدائش سے انتقال تک کے تمام واقعات اور ملکی فتوحات پر مشتمل ہے۔ جبکہ دوسرے حصے میں خلیفہ دوم کے ملکی، مذہبی انتظامات، علمی کمالات اور ان کے اخلاق و عادات کا مفصل بیان ہے۔مولانا شبلی نے اس کتاب کی تصنیف میں روایت و درایت کا بالخصوص اہتمام کیا ہے۔مولانا شبلی نے واقعات کی جانچ کے دو طریقے بتائے ہیں۔اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

> ''واقعات کے جانچنے کے صرف دو طریقے ہیں۔روایت و درایت۔روایت سے یہ مراد ہے کہ جو واقعہ بیان کیا جائے، اس شخص کے ذریعہ سے بیان کیا جائے، جو خود اس واقعہ میں موجود تھا اور اس سے لے کر آخری راوی تک روایت کا سلسلہ متصل بیان کیا جائے، اس کے ساتھ تمام راویوں کی نسبت تحقیق کی جائے کہ وہ صحیح الروایۃ اور ضابط تھے یا نہیں۔درایت سے یہ مراد ہے کہ اصولِ عقلی سے واقعہ کی تنقید کی جائے۔'' [۱]

الفاروق کی تمہید میں مزید ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''واقعات کی تحقیق وتنقید کے لئے درایت کے اصول سے بہت بڑی مدد مل سکتی ہے۔'' [۲]

حضرت عمر کی سوانح کو انہوں نے بڑی چھان بین کے بعد لکھی ہے۔اس کے لئے انہوں نے اسلامی ممالک کا سفر بھی کیا ہے۔الفاروق کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی ایک سوانح نگار کے ساتھ مؤرخ بھی ہیں۔

حیدرآباد میں ملازمت کے دوران شبلی نے امام غزالی اور مولانا جلال الدین روم کی سوانح عمریاں الغزالی اور سوانح مولانا روم کے نام سے لکھیں۔ چند مہینوں میں تصنیف کی گئی الغزالی میں امام غزالی کے حالات زندگی، علمی کارنامے اور ان کی معروف تصانیف کا ذکر ہے۔ سوانح مولانا روم میں فارسی کے مشہور شاعر مولانا جلال الدین روم کی حیات، شاعری اور علمی کارناموں کا مفصل ذکر ہے۔ مہدی افادی نے شبلی کے بارے میں سچ کہا تھا وہ تاریخ کے بغیر لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی اپنی سوانح عمریوں میں تاریخ اور حقائق پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ فن سوانح نگاری پر کم توجہ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ الغزالی اور سوانح مولانا روم فن سوانح نگاری کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی ہیں۔

شبلی نے حضرت محمد ﷺ کی سیرت کو لکھ کر اپنا نام ممتاز سوانح نگاروں اور سیرت نویسوں کی فہرست میں شامل کرالیا۔ انہوں نے ''بدء الاسلام'' کے نام سے سیرت نبوی پر ایک مختصر رسالہ علی گڑھ پہنچنے کے بعد لکھا۔ یہ رسالہ اس وقت علی گڑھ کے نصاب میں داخل بھی تھا۔ ان کا سب سے بڑا اور زندۂ جاوید کارنامہ ان کی کتاب ''سیرۃ النبیؐ'' ہے۔ اس کتاب نے شبلی کو شہرت دوام عطا کی۔ مولانا شبلی سیرت النبی تصنیف کرکے مغربی مستشرقین کے آنحضرت ﷺ کی شخصیت و سیرت سے متعلق بیان کی ہوئی غلط بیانیوں کو دور کرنا چاہتے تھے، ان غلط بیانیوں نے حضور ﷺ کے متعلق مسلم نوجوانوں کے اندر شکوک و شبہات پیدا کردیئے تھے جن کا ازالہ صحیح اور معتبر روایتوں پر مشتمل سیرت نبوی تصنیف کرکے کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ شبلی نے سیرۃ النبی کی تصنیف کا ارادہ کیا۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے اپنی کتاب مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار میں لکھا ہے کہ

> ''مولانا شبلی سیرت کی قدیم کتابوں سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کی سیرت کے موضوع پر صحیح روایات کے التزام کے ساتھ ایک مستند کتاب مرتب ہوجائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے یہ بلند معیار پیش نظر رکھنا چاہا تھا کہ سیرت کے واقعات اولاً قرآن سے اخذ کئے جائیں۔ بعدہٗ احادیث کی کتابوں سے مراجعت کی جائے۔

سب سے آخر میں کتب سیرت کی روایات کام میں لائی جائیں۔ مزید برآں روایات کی ترجیح کے باب میں محدثین کے دقیق اصولوں سے استفادہ کیا جائے۔'' ۳

مولانا شبلی فرماتے ہیں:

''خاص سیرت پر آج تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا۔ حافظ زین الدین عراقی جو حافظ ابن حجر کے استاذ تھے، سیرۃ نبوی میں لکھتے ہیں۔

ولیعلم الطالب ان السیرا تجمع ما صح وما قد اُنکِرَ

'یعنی طالب فن کو جاننا چاہئے کہ سیرت میں ہر قسم کی روایتیں نقل کی جاتی ہیں۔ صحیح بھی اور قابل انکار بھی'

یہی سبب ہے کہ مستند اور مسلم الثبوت تصنیفات میں بھی بہت سی روایتیں شامل ہوگئیں، اس بنا پر ضروری تھا کہ نہایت کثرت سے حدیث ورجال کی کتابیں بہم پہنچائی جائیں اور پھر نہایت تحقیق اور تنقید سے ایک مستند تصنیف تیار کی جائے۔'' ۴

۱۸۹۲ء میں شبلی کو اس وقت اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کا موقع ملا جب وہ علی گڑھ میں فارسی کے استاد تھے۔ اس سفر سے شبلی کو مسلم ملکوں کے رسم و رواج، وہاں کے باشندوں کے رہن سہن اور اخلاق و عادات سے متعارف ہوئے۔ اس کا ذکر انہوں نے بہت ہی سادہ، آسان اور شیریں انداز میں ''سفرنامہ'' میں کیا ہے۔ یہی شبلی کی طرز تحریر کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اس میں نثر نگاری اور انشاء پردازی کی تمام خصوصیات یکجا ہیں، اگر اس سفرنامہ کو سفرنامہ کی حیثیت سے دیکھا جائے تو پوری طرح لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا، ہاں اسلامی ممالک کے معمولی واقعات اور رہن سہن سے لطف اندوز ہونے والوں کے لئے ایک نایاب تحفہ ہے۔

علی گڑھ میں جب مولانا شبلی نے تہذیب الاخلاق میں ۱۸۹۵ء میں المعتزلہ و الاعتزال کے نام سے مضمون لکھا تھا تو اسی وقت ''علم الکلام'' کی تاریخ کا ابتدائی خاکہ

ان کے دماغ میں آیا۔علم الکلام پر لکھنے کے بعد انہوں نے ''الکلام'' کے نام سے ایک اور کتاب لکھی۔ الکلام میں انہوں نے بقیہ عقائد کے نام سے ان عقائد کو بیان کیا ہے جن کو مناظرانہ علم کلام نے پیدا کیا ہے۔ جن کی اصل کتاب وسنت میں نہیں ہے اور روحانیت یا غیر محسوسات کے نام سے ان عقائد کو لکھا ہے جن کی صراحت کتاب وسنت میں ہیں۔علم الکلام اور الکلام کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی روایت اور درایت کے باہمی ربط پر گہری نظر رکھتے تھے۔

سیرت النبی اس وقت لکھی گئی جب انہیں فن سوانح نگاری اور نثر نگاری پر مکمل عبور حاصل ہو چکا تھا اور تصنیفی میدان میں اپنے ہم عصروں سے آگے نظر آنے لگے تھے۔شبلی نے اس کتاب کو بڑی محنت اور تحقیق سے لکھی ہے۔ انہوں نے محدثین کے قائم کردہ اصول روایت و درایت سے استفادہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے ساتھ ہی اسلام پر کئے جارہے اعتراضات کے دندان شکن جواب بھی دیے ہیں۔افسوس صرف اس بات کا ہے کہ موت نے انہیں سیرت نبوی مکمل کرنے کا موقع نہ دیا۔موت سے کچھ دن قبل سیرۃ النبی کا یہ حصہ جو عالمانہ و تفتیش شبلی کی سیرت نویسی کا نمایاں وصف ہے لکھا جا چکا تھا۔سیرۃ النبی شبلی کا بہت بڑا تحقیقی کارنامہ ہے۔انہوں نے مرزا علی لطف کے ''تذکرہ گلشن ہند'' کو ۱۹۰۶ء میں ترتیب دے کر ایک اور تحقیقی کارنامہ انجام دیا جس پر مولوی عبدالحق نے مقدمہ لکھا ہے۔شبلی نے اپنی تمام تصانیف میں جدو جہد اور محنت و مشقت کے ساتھ حقائق پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان کے تاریخی اور تحقیقی مضامین ''مقالات شبلی و رسائل شبلی'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔شبلی دراصل ایک اچھے مضمون نگار تھے۔انہوں نے ادبی، علمی، تاریخی، مذہبی، تنقیدی اور فلسفیانہ مضامین کے علاوہ مختلف علمی موضوعات اور کارآمد مضامین پر قلم اٹھایا ہے۔ان مضامین کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔''مقالات شبلی'' علمی اعتبار سے ایک اہم اور نادر کتاب سمجھی جاتی ہے اور ''رسائل شبلی'' میں اسلامی حکومتیں اور شفا خانے،

اسلامی کتب خانے ، تراجم ، الجزیہ ، حقوق الذمیین اور اسلامی مدارس وغیرہ سے متعلق مضامین ہیں۔ اس میں ان کتابوں کی فہرست بھی ہے جو مسلمانوں نے مختلف ٹکنیکل فنون پر لکھیں۔ اس میں مولانا شبلی کے ہاتھ کا لکھا ہوا مقدمہ بھی شامل ہے۔

''موازنہ انیس و دبیر'' شبلی کا اہم کارنامہ ہے۔ شبلی ایک اہم تنقید نگار ہیں۔ انہوں نے تاثراتی تنقید اور تقابلی تنقید دونوں سے کام لیا ہے۔ موازنہ انیس و دبیر تقابلی تنقید کی بہترین مثال ہے۔ اس کتاب میں دونوں شاعروں کے فن کا موازنہ کر کے ان کی شعری قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی مدت سے یہ خواہش رہی ہے کہ کسی شاعر کے کلام پر تقریظ و تنقید لکھی جائے ۔ چونکہ مولانا شبلی میر انیس کے مداح تھے اور ان کے محاسن کے دلدادہ بھی، اس لئے انیس کو موضوع بنایا، اس میں میر انیس کا مرزا دبیر سے موازنہ کیا گیا ہے۔ مولانا شبلی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

> ''مدت سے میرا ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ و تنقید لکھی جائے، جس سے اندازہ ہو سکے کہ اردو شاعری باوجود کم مائیگی زبان ،کیا پایہ رکھتی ہے۔ اس غرض کے لئے میر انیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کیلئے موزوں نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔اس کتاب میں میر انیس کا موازنہ بھی مرزا دبیر سے کیا گیا ہے اور اس مناسبت سے اس کا نام موازنہ ہے۔'' ۵

انہوں نے میر انیس کو اپنا ہیرو تسلیم کر کے یہ ثابت کیا کہ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں کسی اور کے کلام میں نہیں پائے جاتے ، یہ ان کی پہلی ادبی تصنیف ہے۔ شبلی کی بعض ادبی خوبیاں جو ان کی گزشتہ تصانیف میں نہ ابھر سکی تھیں اس کتاب میں بکھرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے مرزا دبیر کو انیس سے کم تر درجہ کا شاعر اور مرثیہ نگار قرار دیا ہے۔ بعض حلقوں سے یہ آواز تک اٹھتی ہے مولانا جس کو پسند کرتے ہیں اس کے عاشق ہو جاتے ہیں۔ یہ اعتراض غیر مناسب ہے کیونکہ انہوں نے اپنے ہیرو یعنی مامون ، امام ابوحنیفہ اور امام غزالی کی خامیوں کو بالکل نظر انداز نہیں کیا ہے، یہی رویہ

انہوں نے میر انیس کے ساتھ بھی اپنایا ہے۔ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان فروگذاشتوں کے اظہار اور بیان کرنے میں ان کا وہ زورِ قلم نظر نہیں آتا جو میر انیس کے کمالات دکھانے میں ظاہر ہوتا ہے۔ مولانا شبلی نے انیس و دبیر کے تذکرے اور ان کے موازنے میں جو طریقہ کار اختیار کیا ہے اس سلسلے میں رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''اس کتاب میں دبیر کا تذکرہ، انیس کے مقابلے میں کم، بہت کم ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ دبیر کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہو یا دونوں کی شاعری کا موازنہ کیا ہی نہ گیا ہو یا دبیر کے کلام کا مطلق اعتراف نہ کیا گیا ہو، شبلی نے کئی جگہ دبیر کی علمیت، قوت تخیل اور مضمون آفرینی کا ذکر کیا ہے۔ تشبیہات و استعارات کی جدت کا بھی تذکرہ کیا ہے، مثالیں بھی دی ہیں، لیکن ان کا کہنا یہ ہے کہ دبیر کے یہاں محاسن کے مقابلے میں معائب زیادہ ہیں۔'' [۶]

مولانا کے مکتوبات سے اندازہ ہوتا ہے کہ موازنہ انیس و دبیر کی طباعت سے پہلے ''شعر العجم'' کو لکھنا شروع کر دیا تھا۔

ان کا مشہور تنقیدی و تحقیقی کارنامہ ''شعر العجم'' ہے جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی مختلف جلدیں مختلف زمانوں میں شائع ہوئیں جس کا چوتھا حصہ قابل ذکر ہے۔ جو فارسی شاعری کی تاریخ میں مولانا کی دلچسپی کا پتہ دے رہا ہے۔ شعر العجم کے اس حصے میں ایران کی آب و ہوا، شعر و شاعری، اس پر پڑنے والے اثرات اور اس میں پیدا ہونے والے تغیرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ شاعری کے تمام انواع اور شاعری میں پائی جانے والی صنعتوں کا تفصیلی ذکر ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس نے شبلی کو تنقید نگاروں کی صف اول میں لا کھڑا کیا۔

یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں شاعری کی حقیقت، محاکات، تخیل، تشبیہ و استعارات، جدت و لطف ادا، واقفیت و اصلیت اور شعر و شاعری پر محققانہ گفتگو ہے۔ دوسرے باب میں ایران میں فارسی شاعری کے آغاز و ارتقا، عربی شاعری کا اثر،

فارسی شاعری کا اثر عرب پر، نظام حکومت کا اثر شاعری پر، شخصی اور خود مختار حکومت کا اثر وغیرہ بیان کیا گیا ہے۔ جبکہ تیسرے باب میں فارسی شاعری پر تبصرے کے ساتھ مثنوی سے متعلق طویل بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے اردو فارسی شاعری میں لاجواب ہے۔

شعرالعجم مولانا کی معرکہ آرا اور بلند پایہ ادبی تصنیف ہے۔ اس کتاب کی علمی و ادبی حلقوں میں زبردست پذیرائی کی گئی ہے۔ اس کتاب کا موضوع فارسی شاعری ہے۔ اس کی اشاعت پر جہاں توصیفی تبصرے لکھے گئے وہیں اس کی بہت سی خامیاں بھی گنائی گئی ہیں۔ محمود شیرانی نے تو ''تنقید شعرالعجم'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب بھی لکھ دی۔

شبلی نے شعرالعجم اور موازنہ کے ذریعہ نظری اور عملی تنقید کا نمونہ پیش کیا ہے۔ موازنہ تدریسی حلقوں میں زبردست مقبول رہا ہے۔ اردو میں تقابلی تنقید کی یہ پہلی مثال ہے۔ اس کتاب پر داد و تحسین کے علاوہ تنقیدیں بھی بکثرت ہوئی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ موازنہ کا پورا حق ادا نہ کر کے جانبداری سے کام لیا گیا ہے، مرثیہ گوئی کی تاریخ پر تفصیلی روشنی نہ ڈال کر سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ مولانا نے طویل مثالوں سے اس کتاب کی ضخامت بڑھادی ہے۔ ان خامیوں کے باوجود یہی کہا جائے گا کہ اردو تنقید کے ارتقاء میں موازنہ کا ایک اہم رول ہے۔

اس کے علاوہ انہوں نے حیات خسرو، تنقید جر جی زیدان اور اورنگ زیب عالمگیر کے علاوہ چند خطوط لکھے ہیں۔ خطوط کے مجموعہ ''مکاتیب شبلی'' سے ان کی زندگی کے بعض دلچسپ پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے وہ خطوط جو عطیہ بیگم فیضی اور زہرہ بیگم فیضی کو لکھے گئے تھے۔ بے تکلف انشاء پردازی کی جان ہیں۔ خطوط میں وہ ایک زندہ دل شبلی نظر آتے ہیں۔ مولانا بہت مختصر خط لکھتے تھے، کبھی ہاں یا نہیں لکھ کر جواب دے دیتے تھے۔ مگر اس اختصار میں بھی انشاء پردازی اور بلاغت کا کمال و جمال نظر آتا ہے۔ عطیہ بیگم فیضی کے نام تحریر کردہ ایک خط میں شبلی کی انشاء پردازی اور ظرافت دیکھیں:

''اس ستم ظریفی کو دیکھئے مہینہ بھر بمبئی رہیں اور مطلق خبر نہ دی۔ خبر تھی کہ بیگم صاحب بھوپال کے ساتھ ولایت جارہی ہیں۔ اس زہرا صاحب کو لکھا، وہ چپ رہیں، بہت پتہ لگایا کہ بمبئی میں تم ہوتو آؤں کچھ پتہ نہ چلا، ۶/مئی کے بعد زہرا صاحب کا خط آیا کہ سب لوگ جنجیرہ آگئے، اب جا کر یہ خط آیا، سبحان اللہ۔'' ؎

انہوں نے اپنی زندگی میں مذہبی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی، تاریخی، فلسفیانہ اور سیاسی مضامین بکثرت لکھے ہیں۔ انہوں نے مدلل اور محققانہ مضامین لکھ کر تمام اہل علم اور اہل قلم حضرات سے اپنی صلاحیت منوا کر اپنا نام صف اول کے ادیبوں میں درج کرالیا ہے۔ انہوں نے اپنے قلم سے الندوہ کی خدمت کی ہے۔ الندوہ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام بھی کیا ہے۔ الندوہ میں ان کے اور دوسرے علماء کے علمی وادبی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

شبلی اردو زبان وادب کے لئے ایک ناقابل فراموش شخصیت ہیں۔ ان کی تصانیف تاریخ، سوانح، سیرت، علم کلام، تنقید و تحقیق اور فلسفہ کے ذیل میں آتی ہیں۔ جو ہماری زبان کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ شبلی کی تحریریں مدلل، عالمانہ، متین اور شگفتہ ہوتی ہیں۔ سرسید کے کتب خانہ کی وجہ سے شبلی تاریخ کی طرف متوجہ ہوئے۔ تاریخی واقعات کی چھان بین اور حقائق کے پیش کرنے میں اصول روایت اور درایت کا استعمال کرتے ہیں جو کہ تحقیق کا تقاضہ ہے۔

سوانح نگاری میں حالی کے بعد شبلی اردو کے دوسرے بلند پایہ سوانح نگار ہیں۔ ان کی گراں قدر خدمات سوانح کے میدان میں بہت ہیں۔ تحقیق، جزئیات نگاری، کثرت معلومات، حسن انتخاب اور زبان و بیان کے استعمال میں دیگر ہم عصر سوانح نگاروں سے بہتر ہیں۔ شبلی ایک معتبر اور مستند انشاء پرداز ہیں۔ ادب میں ان کا مقام بہت ہی اہم ہے۔ ان کی نثر میں توازن، اعتدال اور ایک خاص طرح کا احساس جمال پایا جاتا ہے۔ ہر لفظ کو مناسب موقع اور محل میں استعمال کرتے ہیں۔

ادب میں ان کے بیشتر کارنامے انتقادی ہیں۔ ان کی تنقیدی تصانیف کے مطالعہ سے

احساس ہوتا ہے کہ شبلی کے تنقیدی نظریات حالی کے نظریات سے مختلف ہیں۔ ان کے بیشتر تحقیقی مضامین مقالات شبلی اور رسائل شبلی میں موجود ہیں۔ آٹھ جلدوں پر مشتمل ان مقالات کا مجموعہ ایک نایاب ذخیرہ ہے۔ وہ اپنی تصنیفات میں تاریخی مباحث کو بڑی چھان پھٹک اور تحقیق کے بعد پیش کرتے تھے۔ سیرۃ النبی بھی ان کی تحقیقی خدمات کی فہرست میں آتی ہے مگر اسے ادبی تحقیق کا درجہ حاصل نہیں۔ ان کے دیگر مضامین اور مکاتیب بھی کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔

شبلی اردو کے بڑے مصنفوں میں شمار کیئے جاتے ہیں۔ شبلی کی فکر، لب ولہجہ اور ان کی تحریر وتقریر میں متانت، سنجیدگی اور عالمانہ رکھ رکھاؤ ہونے کے ساتھ ان کی فطرت میں چھپی ہوئی ظرافت، خوش طبعی اور مزاح وشوخی بھی تھی۔ ان کی تحریروں میں استدلالی طرز بکثرت ملتی ہیں۔ وہ اپنی باتوں کو محققانہ انداز میں کہتے تھے۔ ایسے مضامین کے لکھنے میں جس سے یہ پتہ چل سکے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کے فن معانی و بیان سے پوری دلچسپی لی ہے، مولانا شبلی نے بڑی فراخ دلی اور رواداری کا ثبوت پیش کیا ہے۔

شبلی کے کلام میں سادگی و پر کاری کے ساتھ کہیں کہیں ظرافت بھی نظر آجاتی ہے۔ جملوں میں الفاظ کا انتخاب ایسے کرتے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ بیان میں صفائی اور بے ساختگی سے عبارت میں ایک خاص تڑپ اور چمک پیدا کر دیتے ہیں۔ مختلف مضامین کیلئے مختلف اسالیب بیان کے استعمال کرنے میں انہیں کوئی دقت و پریشانی نہیں ہوتی، ان کے پاس لفظوں کا ذخیرہ ہے۔ جس طرح چاہتے ہیں ان کے ذریعہ نئی نئی باتیں پیش کر دیتے ہیں۔ ان کی تحریر میں جدت وندرت اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے۔ ان کی رفعت تخیل اور وسعت تحقیق نے تحریروں میں خود اعتمادی پیدا کر دی ہے اور اسی خود اعتمادی نے منطق استدلال پیدا کیا ہے۔ ان کا شمار اردو کے صاحب طرز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کی عبارتیں کبھی کبھی اتنی جاذب نظر اور دلکش بن جاتی ہیں کہ ان میں شعریت کے عنصر کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔

حوالہ جات

۱ۡ الفاروق، مولانا شبلی، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۵۶ء، ص: ۱۱۔۱۲

۲ۡ الفاروق، ص: ۱۴

۳ۡ مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، ۲۰۰۱، ص: ۵۳

۴ۡ سیرۃ النبی حصہ اول، مولانا شبلی نعمانی، معارف پریس، اعظم گڑھ، ص ۸۔۹۔۱۰، طبع ششم

۵ۡ موازنہ انیس و دبیر، شبلی نعمانی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۶۹ء، ص: ۱۱

۶ۡ موازنہ انیس و دبیر، تعارف ص: ۸

۷ۡ خطوط شبلی، مرتبہ مولوی محمد امین صاحب، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۳۵ء، ص: ۹۸

دوسرا دور

- مولوی عبدالحق
- حافظ محمود خاں شیرانی
- سید مسعود حسن رضوی ادیب
- نصیرالدین ہاشمی
- مولانا غلام رسول مہر
- قاضی عبدالودود
- وجاہت حسین عندلیب شادانی
- سید محی الدین قادری زور
- مولانا امتیاز علی خاں عرشی

مولوی عبدالحق

(۱۶ر نومبر ۱۸۷۲ء ـ ۱۶ر اگست ۱۹۶۱ء)

اردو زبان و ادب کے سچے عاشق اور ساری زندگی اردو کے نام وقف کرنے والے بابائے اردو مولوی عبدالحق میرٹھ کے ایک مشہور قصبہ ہاپوڑ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد شیخ علی حسین ایک مذہبی اور دیندار بزرگ تھے۔ مولوی عبدالحق کی پیدائش ہاپوڑ سے متصل ایک چھوٹی سی بستی سراوہ میں ہوئی اور سراوے ہی میں ان کا بچپن گزرا۔ سراوہ ان کے والدہ کا میکہ ہے۔ ان کے والد انسپکٹر مال مقرر ہو کر جب پنجاب گئے تو اپنے والد کے ساتھ عبدالحق بھی پنجاب چلے گئے اور پنجاب ہی سے دسویں کا امتحان پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لئے علی گڑھ پہنچے۔

عبدالحق ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس نے ساری زندگی زبان و ادب کی خدمت کی ان کی شناخت کئی حیثیتوں سے ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق اردو کے نقاد، محقق، ماہر دکنیات کے علاوہ اردو تحریک کے علم بردار تھے۔ ان کی زندگی اردو اور انجمن ترقی اردو کی خدمت میں گزری۔ وہ ہمت نہ ہارنے والے مسلسل جدو جہد کرنے والے انسان تھے۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ انجمن ترقی اردو سے وابستگی ہے۔ عبدالحق حیدرآباد میں رہ کر اردو زبان و ادب کی ترقی و اشاعت کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہے۔ اردو کی جدو جہد کو تیز

کرنے کیلئے انجمن ترقی اردو کو حیدر آباد سے دہلی منتقل کرایا۔ حیدر آباد کے علمی و ادبی ماحول اور اردو نوازی نے انہیں بابائے اردو کہلوایا۔ ان کی تصنیفی زندگی کم و بیش پچہتر برس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس دوران انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کی تصانیف، مرتبات اور تراجم کی فہرست بہت طویل ہے۔

اردو کے اولین ناقدین و محققین میں حالی اور شبلی کے بعد مولوی عبدالحق پر نگاہ ٹھہرتی ہے۔ وہ حالی سے بہت زیادہ اور براہ راست مغربی تصورات سے واقف ہیں اور ان کا اسلوب مشرقی نفاست میں شبلی سے قریب تر ہے۔ وہ ادب میں شبلی اور حالی کا مجموعہ ہیں۔

انہوں نے کوئی تنقیدی کتاب نہیں لکھی۔ ہاں، انہوں نے مقدمے اور تبصرے بکثرت لکھے ہیں، جن میں وہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں جو مقالات اور مضامین میں ہونی چاہئیں۔ ان کی تحریروں سے محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی تنقید کو کسی ایک اصول کا پابند نہیں بنایا۔ ان کے ہاں بہت سے تنقیدی مکاتب خیال کے اثرات کی آمیزش دکھائی دیتی ہے۔ ان کی تنقیدیں سائنٹفک اسکول کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان میں تاثراتی تنقید کا پرتو بھی جھلکتا ہے اور تقابلی انداز بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن تقابلی انداز اور طریقے ان کی تحریروں میں کثرت کے ساتھ نہیں ملتے۔ انہوں نے ''مقدمہ باغ و بہار'' اور ''دیوان اثر'' میں تقابلی تنقید کی اچھی مثالیں پیش کی ہیں۔ باغ و بہار میں میر امن کے ''قصہ چہار درویش'' اور تحسین کے ''نوطرز مرصع'' کے اسالیب، قصے کی اٹھان اور واقعات کی ترتیب کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے دونوں تصانیف کی مشترکہ خصوصیات اور انفرادیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں:

> ''نوطرز مرصع اور باغ و بہار کے طرز بیان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ نوطرز مرصع کی عبارت نہایت رنگین سرتاپا تشبیہات و استعارات سے مملو ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات پڑھتے پڑھتے جی متلانے لگتا ہے۔ تحسین نے اپنے بیان میں عام قصہ گوؤں کا طرز اختیار کیا ہے۔ آج کل اس کا پڑھنا طبیعت پر بار ہوتا ہے۔ زبان کا ڈھنگ پرانا

ہے اور فارسی ترکیبوں اور الفاظ سے بھر پور ہے۔ باغ و بہار سے اسے کچھ نسبت نہیں۔'' [1]

مولوی عبدالحق نے بہت سی کتابوں کا پتا لگایا اور انہیں مرتب کر کے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ ان کے مختلف اوقات میں مختلف کتابوں پر لکھے گئے تبصرے عملی تنقید کا نمونہ ہیں۔ یہی مقدمے اور تبصرے ''مقدمات عبدالحق'' اور ''تنقیدات عبدالحق'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

مولوی عبدالحق ایک اچھے خاکہ نگار ہیں۔ انہوں نے اپنے خاکوں میں خواہ مخواہ کی تعریف یا تنقیص نہیں کی ہے بلکہ شخصیت یا سیرت کے دونوں رخ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو کے چند اہم خاکہ نگاروں میں سے ایک نام مولوی عبدالحق کا ہے۔

اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں فرحت اللہ بیگ کے بعد مولوی عبدالحق پر نظر ٹھہرتی ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کی متعدد شخصیتوں پر قلم اٹھایا ہے۔ ان شخصیتوں میں نامور اہل قلم، صاحب ثروت حضرات اور بے حیثیت غریب افراد ہیں۔ مرقع نگاری بہت دلچسپ فن ہے۔ مصور رنگوں سے تصویر کھینچتا ہے اور صاحب قلم لفظوں سے پیکر بناتا ہے۔ مرقع نگاری اور تصویر کشی میں سب سے زیادہ کامیابی ادیب وشاعر کو حاصل ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق کو مرقع نگاری میں کمال حاصل تھا۔ انہوں نے لفظوں کی مدد سے ایسی تصویریں پیش کی ہیں، جن سے حرکات وسکنات اور احساسات و جذبات ظاہر ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

مولوی عبدالحق نے خاکہ نگاری کے فن پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ انہوں نے قوم کو بیدار کرنے اور اس میں ذوق عمل پیدا کرنے کے لئے نامور ہستیوں کی سیرت پر مختلف اوقات میں مضامین لکھتے رہے اور انہیں انجمن کے سہ ماہی رسالہ میں شائع کرتے رہے جسے ان کے شاگرد شیخ چاند نے چند ہم عصر کے نام سے کتابی شکل میں شائع کردیا۔ اس میں شامل کچھ مضامین مختصر سوانح کی حیثیت رکھتے ہیں، کچھ خاکے ہیں اور کچھ ان دونوں کی

درمیانی کڑی۔ خاکہ نگار اپنی پسند کے مطابق کسی کی سیرت کے چند پہلو منتخب کر لیتا ہے۔ اس انتخاب میں اس کی ذاتی پسند اور ناپسند کو بہت دخل ہوتا ہے۔ سوانح نگاری بھی اسی سے ملتی جلتی چیز ہے۔ فرق اتنا ہے کہ سوانح نگار کسی شخصیت کی ولادت، جائے پیدائش، ابتدائی تعلیم و تربیت اور اس کی زندگی کے حالات اور تمام واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔ مگر خاکہ نگار ان حقائق سے دلچسپی نہیں لیتا۔

چند ہم عصر میں سرسید احمد خان جیسے مصلح قوم، مولانا محمد علی جیسے سیاسی رہنما، حالی اور امیر مینائی جیسے شاعر اور محسن الملک اور وحید الدین سلیم جیسے اہل قلم پر لکھے گئے خاکے شامل ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے نام دیو مالی اور نور خاں جیسے گمنام اور غریب لوگوں کی قلمی تصویر بھی پیش کی ہے۔ پورے مجموعے میں یہی دونوں خاکے سب سے زبردست اور جاندار ہیں، نور خاں اور دیو مالی کے ذاتی اوصاف نے ان کو اتنا متاثر کیا کہ وہ ان پر قلم اٹھانے کے لیے مجبور ہو گئے، ان دونوں میں جو خوبیاں تھیں ان کے سبب یہ دونوں زندۂ جاوید ہو گئے۔

ادب کی کوئی بھی صنف اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ مصنف کو اپنے موضوع اور قوت بیان پر مکمل عبور نہ ہو۔ خاکہ نگاری بہت مشکل فن ہے۔ مولوی عبدالحق کے خاکوں کے اس مجموعہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر وہ ''چند ہم عصر'' کے علاوہ کچھ بھی نہ لکھتے، تب بھی اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ عزت و احترام سے اچھے انشاء پردازوں کے ساتھ لیا جاتا۔ مولوی عبدالحق کے حساس دل میں اور انسان دوست ذہن میں ایک سپاہی، ایک مالی سے لے کر حالی اور سرسید جیسی عظیم شخصیتوں تک کی گنجائش ہے۔

مولوی عبدالحق نے حیدرآباد میں رہ کر اپنی کتابوں اور مضامین سے دکنی ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے دکنیات کی طرف اس خصوصیت سے توجہ کی ہے۔ اگر انہیں دکنیات کا پہلا معمار قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ مدرسہ آصفیہ کی عہدہ صدر المدرسین پر مامور ہوئے۔ رسالہ ''افسر'' کے ایڈیٹر بنے اور ۱۹۱۱ء میں انجمن ترقی

اردو کے سکریٹری چنے جانے کے بعد پرانی کتابوں کو ایڈٹ کر کے شائع کرنے کا آغاز کیا۔ انجمن کے لئے کتابیں شائع کی گئیں۔ جنوری ۱۹۲۲ء کے رسالہ ''اردو'' میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلیات پر ایک مقالہ شائع کیا، مولوی عبدالحق نے خواجہ بندہ نواز کی ''معراج العاشقین'' ملا وجہی کی ''سب رس'' اور ''قطب مشتری'' نصرتی کی ''گلشن عشق'' اور ''علی نامہ'' کو تلاش کر کے شائع کیا۔ یہ دکنی نثر و نظم کی قدیم کتابیں ہیں، اس کے علاوہ ان کی تالیف شدہ دکنی کتابوں میں ''اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام'' اور ''نصرتی ملک الشعرائے بیجاپور'' بہت ہی اہم ہے۔ ''اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام'' بیک وقت سیرت، تذکرہ اور ٹھوس تحقیق ہے۔ اس کتاب سے نہ صرف اردو کے آغاز پر روشنی پڑتی ہے اور ابتدائی دور میں اردو کی نشو ونما اور ترویج میں صوفیا کے رول کے بارے میں علم ہوتا ہے بلکہ لسانیاتی پہلو سے یہ اہم کارنامہ ہے۔ اس میں مسلمانوں کی آمد کے بعد کے ہندوستان کی سماجی و معاشی حالات سے بھی آگہی ہوتی ہے۔ یہ کتاب تاریخی اعتبار سے بھی اہم ہے، کیونکہ اس نے اردو کی قدامت کو مستحکم کیا ہے۔ اس کتاب نے اردو کے آغاز کے پرانے نظریوں کو باطل کر دیا ہے۔ کتاب میں صوفیائے کرام کیکلام کے نمونے بھی درج کئے گئے ہیں، یہ کتاب تحقیق کا اچھا نمونہ ہے۔

''مرحوم دہلی کالج'' اسی نوعیت کی کتاب ہے۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں قدیم دہلی کالج کو اہم مقام حاصل ہے۔ دہلی کالج ایک ایسا علمی ادارہ ہے۔ جس میں اردو زبان کے ذریعہ سے اعلیٰ تعلیم کا کامیاب تجربہ کیا گیا۔ اس کتاب میں کالج کے قیام، اس کی مختصر تاریخ اور اس کے کارناموں کے ساتھ ان مصنفین کا حال بیان کیا ہے۔ جنھوں نے اردو میں ٹھوس کارنامے پیش کئے۔ ''نصرتی ملک الشعراء بیجاپور'' میں انہوں نے نصرتی کی شاعری کے اصناف قصائد، مثنوی، غزل، رباعی اور مرثیوں وغیرہ یعنی ان کی تصانیف گلشن عشق، تاریخ سکندری اور علی نامہ وغیرہ پر محققانہ و ناقدانہ بحث کی ہے۔ یہ کتاب دکنی دور کے متعلق ان کا معرکتہ الآراء تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس میں نصرتی کے فن شاعری کو اس طرح

اجاگر کیا گیا ہے کہ قاری کے دل میں نصرتی کے باکمال شاعر ہونے کا نقش بیٹھ جاتا ہے۔ نصرتی دکن کا قدآور اور ممتاز شاعر ہے اس کتاب میں نصرتی کے حالات زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کی پوری بحث جذباتی نہیں فنی ہے۔ ان کی رائے میں نصرتی ولی سے بڑا شاعر ہے۔ اس تصنیف کو مولوی عبدالحق کا تحقیقی کارنامہ سمجھنا چاہئے جو کہ بڑی جد وجہد کے بعد منظر عام پر آئی ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس محنت اور کدو کاوش کی اہمیت کو پر لطف انداز بیان سے اور بڑھا دیا ہے۔

ریڈیو عوامی رابطے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ریڈیو پر کی جانے والی تقریر میں عام فہم، سریع الفہم اور دلچسپ زبان استعمال ہونی چاہئے۔ ان کی تقریریں اس کسوٹی پر پوری اترتی تھیں۔

جن موضوعات پر تقریر کرتے تھے، وہ ان کے ذہن میں پوری طرح روشن ہوتے تھے اور زبان پر انہیں پوری قدرت حاصل ہوتی تھی۔ جس مقام پر وہ تقریر کرنے جاتے، اکثر اس کی تاریخ پر روشنی ڈالتے تھے۔ اردو کا آغاز و ارتقاء، اس کی لسانی خصوصیت، رسم الخط کے مسائل، اس کی ترویج و ترقی کے راستے کی رکاوٹوں وغیرہ سے متعلق ان کی تقریریں خطباتِ عبدالحق میں موجود ہیں۔ انہوں نے لسانی مسائل پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی، اپنے خطبات میں اردو زبان سے متعلق اٹھائے گئے لسانی مسائل پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ انہوں نے لسانی مسائل کو حل کرنے میں جو دادِ تحقیق دی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مولوی عبدالحق نے بہار اردو کانفرنس کے خطبہ صدارت میں اس مسئلے پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ اردو کو کن کن ناموں سے منسوب کیا گیا۔ مولوی عبدالحق کی تقریر و تحریر دونوں میں تحقیقی رجحانات پائے جاتے ہیں۔ مولوی عبدالحق ہمیشہ آسان اردو کی حمایت کرتے تھے۔ آزادی سے قبل انہوں نے یہ سوال اٹھا کر کہ ہم مشکل زبان کیوں لکھتے ہیں؟ کا خود ہی جواب دیا ہے کہ ہم مشکل زبان اس لئے لکھتے ہیں کہ آسان زبان لکھنا آسان نہیں ہے۔

مولوی عبد الحق کا ریڈیو کے لئے لکھی گئی تقریریں اور اردو کی نشر و اشاعت کے لئے پیش کئے گئے خطبے خطبات عبد الحق کا مجموعہ ہیں۔ مولوی عبد الحق ہر کام کو عبادت سمجھ کر کرتے تھے۔ ان کی تقریر یا خطبوں کو اردو میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔خطباتی ادب میں خطبات عبد الحق کو وہ اعلیٰ مقام حاصل ہے، جوفن خطوط نگاری کی تاریخ میں غالب کے خطوط کو حاصل ہے۔ ان کے خطبات میں حالی اور سرسید کے نثر کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔یہ خطبات تاریخی نقطہ نظر سے برصغیر میں سیاسی و ادبی حالات کی مستند دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ان میں واقعیت اور صداقت کی ایسی روح موجود ہے جو تاریخ نگار کے یہاں بھی مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔ان خطبات کی سوانحی اہمیت مسلم ہے۔ان میں سے بعض خطبے تو ان کی خودنوشت سوانح حیات کا کام دیتے ہیں۔انہوں نے اپنے خطبات میں سادگی و پرکاری اور ادبی چاشنی کا وہ اسلوب اختیار کیا ہے جس کی اتباع بہت ہی مشکل ہے۔ یہ خطبات معلومات کا بیش بہا خزانہ، خطبات کا اعلیٰ نمونہ اور اردو علم وادب کا انمول ذخیرہ ہیں۔جس کی اہمیت اور مقبولیت اردو ادب میں کبھی کم نہیں ہوسکتی۔

مولوی عبد الحق نے اردو کے بہت سے اصناف پر طبع آزمائی کی ہے انہوں نے ”اردو صرف ونحو“ اور ”قواعد اردو“ لکھ کر اپنی تخلیقات میں ایک اور صنف کا اضافہ کیا۔ان سے پہلے بہت سے لوگوں نے اردو قواعد کی کتابیں لکھی ہیں مگر ان کتابوں کا مقصد باہر سے ہندوستان آنے والوں کو قواعد کے ذریعہ اردو سکھانا تھا۔ یہ کوششیں اپنی جگہ مسلم ہیں مگر اردو قواعد کا اچھا نمونہ پیش نہ کرسکیں۔ مولوی عبد الحق کی قواعد اردو ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔انہوں نے قواعد نویسی میں عام بول چال کی زبان کو بڑی اہمیت دی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ

> ”اس لئے زندہ زبان کے قواعد نویس کو سب سے اول بول چال کا خیال رکھنا چاہئے اور اس سے قاعدے بنانے چاہئیں۔قواعد میں اول درجہ آواز کا ہے۔ اس کے بعد حروف کا۔ پہلے بول چال ہے بعد میں تحریر۔“ ۲

انہوں نے اپنی تحقیقات سے کئی مردوں کو زندہ کیا۔ اردو کا قدیم دور ان ہی کی تحقیقات کی بدولت زندہ ہے۔ ان کا اردو ادب میں سب سے بڑا کارنامہ ان شعراء اور محققین کو زندگی عطا کرنا ہے جو معنوی طور پر مر چکے تھے۔ انہوں نے مختلف علوم وفنون پر قلم اٹھایا ہے۔لیکن تحقیق کا پلہ سب پر بھاری ہے۔ ان کی تحقیق کی خوبی یہ ہیکہ وہ اپنے موضوع کا پوری طرح مطالعہ کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کی تحقیق اتنی جامع ہوتی ہے کہ پھر مزید تحقیق کی گنجائش کم ہی رہتی ہے۔ ان کی تحقیقات اردو زبان و ادب سے متعلق ہیں۔ ان کی تحقیقات میں خشکی نہیں پیدا ہونے پاتی بلکہ شگفتگی برقرار رہتی ہے۔ انہوں نے محققین کی ایک پوری نسل کو ذہنی طور پر متاثر کیا ہے۔۔ ان کا اثر جامعہ عثمانیہ کے بیشتر اساتذہ پر پڑا ہے۔ انہوں نے تحقیق کا ذوق پیدا کیا اور یہ بتایا کہ تحقیق کے بغیر تنقید آگے نہیں بڑھ سکتی ۔ ان کے تحقیقی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان کی چند تحقیقی تصانیف ''اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام''، ''مرحوم دہلی کالج''، ''خطبات گارساں دتاسی''، ''مقدمہ باغ و بہار'' اور ''مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر'' وغیرہ ہیں۔ جن میں سے کچھ کا ذکر گذشتہ اوراق میں ہو چکا ہے۔

مولوی عبد الحق کا ایک تحقیقی کارنامہ ''سب رس'' ہے۔ پہلے انہوں نے کتاب کے ماخذ تلاش کئے پھر یہ ثابت کیا کہ ملا وجہی نے فارسی قصہ ''حسن و دل'' کا ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب میں ملا وجہی کے حالات کی تحقیق اور ان کے زمانہ کی تحقیق ہے۔ کتاب کے آخر میں نفس قصہ سے بحث کی گئی ہے۔ جو فلسفیانہ نقطہ نگاہ کی حامل ہے۔ یہ بحث بہت دلچسپ ہے۔

مولوی عبد الحق نے ملا وجہی کی دوسری تصنیف ''قطب مشتری'' کو ترتیب دیتے وقت دو نسخوں کو سامنے رکھا۔ ان میں سے ایک قلمی نسخہ جو خود ان کے پاس تھا اور دوسرا نسخہ برٹش میوزیم لندن کا، مولوی عبد الحق نے مثنوی قطب مشتری کی ترتیب کیلئے کافی جد و جہد کی۔ مثنوی کی ترتیب اور ملا وجہی کی شاعری سے متعلق خود لکھتے ہیں۔

''مثنوی کے بیان میں موقع موقع سے چند غزلیں بھی آگئی ہیں۔ یہ غزلیں خود وجہی کی ہیں۔ ان میں زبان اور خیال دونوں اعتبار سے ہندی کا پورا اثر پایا جاتا ہے۔ زبان سادہ اور شیریں ہے۔ الفاظ زیادہ تر ہندی ہیں اور بعض عربی لفظوں کو ہندی لب ولہجہ میں ڈھال کر ہندی بنالیا ہے۔ عاشق عورت ہے اور مرد معشوق۔ فارسی اور ہندی الفاظ کا تناسب ایک اڑھائی کا پڑتا ہے اور یہی ساری مثنوی کا حال ہے۔ یہ گویا اردو کی ابتدائی ترقی یافتہ صورت ہے۔'' [۳]

مولوی عبدالحق نے جن دو قلمی نسخوں کی مدد سے اس مثنوی کو مرتب کیا ہے، اس کے بارے میں مقدمہ میں تفصیلی گفتگو کی ہے اور اشعار کے انتخاب کی وجہ بھی بتلائی ہے۔ قطب مشتری بیک وقت تحقیق اور تنقید دونوں ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں مثنوی کے محاسن شعری کی وجہی کے نقطۂ نظر سے وضاحت کرنے کے علاوہ کتاب کے آخر میں فرہنگ میں مولوی عبدالحق نے متروک دکنی الفاظ کی شرح پیش کی ہے۔

مولوی عبدالحق نے ''تذکرۂ گلشن ہند'' پر بڑی محنت سے پیش لفظ لکھا ہے اور مصنف یعنی مرزا علی لطف کی کوتاہیوں اور لغزشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اسے اردو میں تحقیق در تحقیق کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے صرف مواد کی پیش کش پر اکتفانہیں کیا بلکہ مواد کو بھی کھوجا اور جانچا ہے۔ ''مقدمہ معراج العاشقین'' خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے قلمی رسالہ کی دریافت اور اس کی اشاعت ہے۔ یہ دریافت ایک ایسی تحقیق ہے جس نے دوسروں پر تحقیق کے لیے راستے کھول دیے۔

میر امن نے ''باغ و بہار'' سلیس اور با محاورہ اسلوب میں لکھ کر جدید نثر کی داغ بیل ڈالی اور مولوی عبدالحق نے ''مقدمہ باغ و بہار'' کو شائع کر کے نثر کے سادہ اسلوب کو رواج دیا۔

''مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر'' ایک محققانہ اور عالمانہ مضمون ہے۔ اس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ کس طرح ایرانی تہذیب اور فارسی زبان و ادب کے اثرات

مرہٹی زبان پر مرتب ہوئے۔ مولوی عبدالحق کا یہ تحقیقی مضمون پہلے اپریل ۱۹۰۱ء کے ایک رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں اسے کتابی شکل دی گئی۔

مولوی عبدالحق نے علی گڑھ میں رہ کر سرسید کی سرپرستی میں تربیت پائی۔ سرسید کی تربیت ہی کا اثر ہے کہ ان کی تحریروں میں سرسید کا سا انداز ہے۔ علی گڑھ میں حالی، شبلی، محسن الملک، وقارالملک، چراغ علی اور سرسید کے بیٹے سید محمود وغیرہ کی صحبت سے استفادہ کیا۔ انہوں نے سرسید اور ان کی شخصیت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ انہوں نے سرسید پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی مگر مختلف اوقات میں سرسید کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے والے ان کے مضامین کو ”سرسید احمد خاں، حالات و افکار“ کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں سرسید پر لکھے گئے مولوی عبدالحق کے مضامین شامل ہیں۔

مولوی عبدالحق نے بحیثیت شاعر کبھی شہرت نہیں پائی۔ اگر یہ کہا جائے کہ بابائے اردو شاعر بھی تھے تو حیرت ہوگی۔ جب شعراء ان کے سامنے اپنا کلام سناتے تو وہ بھی مصرع کہہ دیا کرتے، کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی کے شعر میں تھوڑا سا لفظی الٹ پھیر یا ہلکی سی تبدیلی کر دی جس سے شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا۔ مگر ان کی شاعری اپنے ڈھنگ کی ہوتی تھی۔ وہ اوزان اور بحروں سے بے نیاز اور جدید طرز کی ہوتی تھی۔

مولوی عبدالحق نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا اور زندگی کے آخری ایام تک مختلف رسائل و جرائد سے منسلک رہے۔ مولوی عبدالحق سب سے پہلے رسالہ ”افسر“ سے وابستہ ہوئے اور اسی سے انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے ایڈیٹر ہوئے۔ ان کی کوششوں سے ”افسر“ کے قلمی معاونوں میں اضافہ ہوا۔ یہ رسالہ خالص فوجی تھا۔ اس میں کتابوں پر تبصرے بھی شائع ہوئے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے معتمد مقرر ہونے کے بعد اس ادارے کو فعال بنانے اور اردو کی ترویج کے لئے انہوں نے ایک رسالہ ”اردو“ جاری کیا۔ جس کا بنیادی مقصد اردو زبان و ادب کی خدمت کرنا، اس کو فروغ دینا اور انجمن ترقی اردو کے اغراض و مقاصد کی ترویج و اشاعت تھا۔ [illegible] خواص

میں ادب کا اچھا ذوق پیدا کرنا اور ان میں تنقیدی شعور بیدار کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ مولوی عبدالحق اپنے ان مقاصد میں پوری طرح کامیاب رہے۔ اس کے علاوہ جن رسالوں سے بابائے اردو جڑے رہے وہ سائنس، ہماری زبان، قومی زبان، معاشیات اور تاریخ و سیاسات ہیں۔ جن میں ان کے مضامین اور انہیں کی سرپرستی میں دوسرے اہل قلم حضرات کے مضامین شائع ہوتے رہے۔

انہوں نے تقسیم ملک کے وقت ہندوستان میں اردو پر ہو رہی ظلم و زیادتی کو دیکھا اور یہ محسوس کیا کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل تاریک ہے۔ پاکستان میں اردو کا مستقبل تابناک ہوگا، اس لئے وہ اردو کی خاطر پاکستان چلے گئے۔ پاکستان میں اردو کا استحصال دیکھ کر انہیں بڑا دکھ ہوا۔ جس پر انہوں نے ''پاکستان میں اردو کا المیہ'' لکھا۔

مولوی عبدالحق کی بہت سی تخلیقات منظر عام پر آچکی ہیں۔ انہوں نے اپنی تخلیقات میں جو طرز تحریر اختیار کیا ہے وہ دل نشین بھی ہے اور پر اثر بھی۔ ان کا اصل جوہر ان کا اسلوب بیان ہے۔ وہ نثر نگاروں کے اس دبستان سے تعلق رکھتے ہیں، جس کا آغاز سرسید احمد خاں سے ہوتا ہے۔ جس کی ترقی اور اٹھان میں حالی کا اہم رول رہا ہے۔ اس اسلوب کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں عبارت آرائی اور محاورہ کے جا بجا استعمال سے زیادہ موضوع کی سادگی اور وضاحت پر زور دیا جاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں یہ خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ حالی کے بالمقابل ان کا اسلوب زیادہ سلیس اور واضح ہوتا ہے۔ وہ حالی کی طرح مسائل سے الجھنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ جب کبھی ایسے مواقع آتے ہیں تو وہ بڑے سلیقے سے ان سے گزر جاتے ہیں اور اپنے انداز بیان کو گرانبار بھی نہیں ہونے دیتے۔

مولوی عبدالحق صحافی، مترجم، مقرر، مقدمہ نویس، قواعد نویس، نقاد اور محقق تھے۔ وہ ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اور اردو تحریک کے علم بردار اور اردو کے مرد مجاہد تھے۔ ان کی تحریروں میں سرسید کی سادگی ہے، مگر سرسید کے اسلوب کا نشیب و فراز نہیں، کیونکہ سرسید کبھی کبھی عام بلندی کی سطح پر اتر آتے ہیں اور مولانا عبدالحق کی اس سادگی اور سلاست

میں ایک سنجیدہ معیار برقرار رہتا ہے۔ زبان کی سادگی پر مولوی عبدالحق ہمیشہ زور دیتے تھے۔ تصنع اور بیجا بناؤ سے دور رہتے۔ مشکل اصطلاحوں کو بھی ناپسند کرتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ سادہ زبان لکھنا بہت مشکل ہے۔ سادگی بعض وقت بے مزہ ہو جاتی ہے۔ سادگی کے ساتھ وضاحت اور لطف بیان کو قائم رکھنا بڑا کمال ہے۔ وہ سادہ اور آسان زبان کو پسند کرتے تھے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ زبان روکھی، پھیکی اور بدمزہ نہ ہو جائے۔

مولوی عبدالحق اپنی تحریروں کو بیچ بیچ میں ظریفانہ جملے اور پر لطف باتیں لکھ کر دلکش بنا دیتے ہیں۔ ان کو جب کسی کی بات ناگوار لگتی تو صاف اور برملا کہتے۔ اس پر وار کرتے اور اس کا مضحکہ اڑانے میں انہیں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ ان کے طنز کا نشانہ بڑے بڑے اکابر ادیب اور سیاست داں بنے، ان کے طنز میں نشتر کی سی کاٹ ہوتی ہے۔ ان کے اندر جرأت اور بے باکی بہت زیادہ تھی۔ اس بے باکی نے ان کے اسلوب میں زور اور جوش پیدا کر دیا تھا۔ ان کی خاص توجہ مواد پر ہوتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی بات وضاحت کے ساتھ دوسروں تک پہونچے، یہی وجہ ہے کہ وہ شاعرانہ انداز سے ہمیشہ دور رہتے تھے۔ ان کا نقطہ نظر لسانی سے زیادہ سماجی ہوتا ہے۔ وہ زبان کے انہیں پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ جو ہماری سماجی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مقدمات عبدالحق، مولوی عبدالحق، اردو مرکز لاہور، ۱۹۶۴ء، ص: ۳۲۶

۲۔ قواعد اردو، مولوی عبدالحق، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۵۸ء، ص: ۳۵

۳۔ قطب مشتری، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۳۸، ص: ۱۸

حافظ محمود شیرانی

(۵/اکتوبر ۱۸۸۰ء - ۱۵/فروری ۱۹۴۶ء)

حافظ محمود شیرانی کی پیدائش ۵/اکتوبر ۱۸۸۰ء کو ٹونک میں ہوئی اور ٹونک ہی میں ۱۵/فروری ۱۹۴۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔

حافظ محمود شیرانی اپنے وقت کے ایک عالم اور فاضل تھے۔ تحقیق و تنقید کے میدان میں آج بھی ان کا شمار صف اول کے ناقدین و محققین میں ہوتا ہے وہ زندہ رہے تو تاریخی کرداروں کو زندہ کرتے رہے اور مرے تو تاریخی کردار ان کو زندہ کر رہے ہیں۔

محمود شیرانی ایک ایسے اسکالر تھے، جن کی اسکالرشپ کا دائرہ نہ صرف اردو اور فارسی بلکہ تاریخ اور دوسرے مضامین جیسے فلسفہ وغیرہ سے بھی متعلق تھا۔ وہ ان عالموں میں تھے جنہوں نے اردو میں بہت ٹھوس کام کئے شیرانی کی تاریخی اہمیت یہی ہے کہ انہوں نے ادبی تحقیق کے میدان میں بت شکنی کا آغاز کیا۔ شبلی اچھے ادیب ہیں، مسلم شعری ذوق رکھتے ہیں مگر محمد حسین آزاد شاندار انشاء پرواز ہیں، اردو ادب کے محسن ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد پروفیسر بڑی ڈگریوں کے مالک ہیں لیکن زبان و ادب کے رموز سے واقف نہیں اس لئے ان کی تحقیقات پر مکمل بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ محمود شیرانی بت شکنی کرتے رہے اور لکھنے

والوں کو سکھاتے رہے کہ اور محتاط بنئے، جستجو میں مزید گہرائی کے لئے علم میں مزید گیرائی پیدا کیجئے۔

شیرانی کا طریق تحقیق یہ تھا کہ جو بات لوگ اب تک مانتے چلے آئے ہیں بلا تحقیق اُسے کیوں مان لیا جائے، پہلے وہ تحقیق کرتے تھے پھر وہ جن نتائج پر پہنچتے تھے، بے کم و کاست بیان کر دیتے تھے۔ خواہ وہ دوسروں کے لئے برہمی کا باعث ہی کیوں نہ ہوں۔ شیرانی نے ادبی تحقیق کے میدان میں جو سرمایہ چھوڑا ہے وہ اصول تحقیق اور عملی تحقیق دونوں کو سمجھنے اور نمونہ بنانے کے لئے آج بھی معاون ہے۔ شیرانی کی تحریروں سے یہ اصول و ضوابط اخذ کئے جا سکتے ہیں کہ حقیقت کی تلاش و جستجو نہایت دشوار اور دلچسپ ہے۔ یہ کام کسی مادی لالچ کے زیر اثر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تحقیق کے لئے تقلیدی انداز سم قاتل ہوتا ہے۔ شیرانی کے نزدیک محقق کو خوش اعتقاد نہیں بلکہ متشکک ہونا چاہئے، مثبت تشکک کے جذبے کے ساتھ دریافت کردہ سچائیوں کو بے کم و کاست بیان کرنا تحقیق کا تقاضہ ہے۔ اپنے ذہنی مغالطوں کے سبب کسی دوسرے مصنف کو لعن طعن کرنا ان کے نزدیک ناپسندیدہ بات تھی۔ دوسروں کی تحقیق کا احتساب کرتے وقت اس کے کام کی اہمیت اور اس کے مثبت پہلوؤں کا اعتراف کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ جس تالیف پر تنقید کی جائے اس کے مؤلف کو اس کی اطلاع ضرور ہونی چاہئے۔ صرف اغلاط کی نشاندہی کافی نہیں بلکہ درست واقعات و حقائق کے انکشاف کو تحریر میں لانا ضروری خیال کرتے تھے۔ محقق کے لئے ضروری ہے کہ متعلقہ زبان کے تمام ارتقائی مراحل سے واقفیت ہو۔ انہوں نے ماخذ کی تلاش پر زور دیتے ہوئے اردو تحقیق کو ماخذ کی درجہ بندی اور معیار گری کا انتہائی اہم سبق بھی سکھایا ہے۔ بغیر دیکھے کسی کتاب کا حوالہ نہیں دینا چاہئے۔ ساتھ ہی دوسرے اہل علم کی تحقیقات سے استفادہ ضرور کرنا چاہئے۔

محمود شیرانی کے بیٹے اختر شیرانی دوسرے میدان کے تھے۔ ہاں اختر کے بیٹے یعنی محمود شیرانی کے پوتے مظہر محمود شیرانی ان کے جانشین ہوئے۔ مظہر محمود شیرانی نے حافظ محمود

شیرانی کے مقالات کو آٹھ جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ ان مقالات میں ان کی شائع شدہ اکثر کتابیں اور مقالات آ گئے ہیں۔ جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ، مسکوکات، عروض، لغات اور ادب کی آمیزش سے انہوں نے ادبی تحقیق کے میدان میں کتنے کارنامے انجام دیے ہیں۔ علمی معاملات میں وہ سخت محنت کے عادی تھے۔ ذہن میں اعتدال اور توازن تھا۔ ان کا تحریری کام وسیع بھی اور رنگا رنگ بھی ہے۔ انہوں نے لسانیات، تحقیق، تدوین، تنقید، تاریخ، عروض اور مسکوکات میں اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں۔

لسانیات کے میدان میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' ہے۔ یہ کتاب صحیح معنوں میں اردو لسانیات کے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ اس موضوع پر لکھنے کے لئے نہ صرف زبان کے مختلف پہلوؤں پر گہری نظر رکھنا ضروری تھا بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ سے کما حقہ واقفیت بھی لازمی تھی۔ محمود شیرانی مسلمانان ہند کی تاریخ کا شعور رکھتے تھے۔ اس کتاب میں شیرانی کو متعصب ہونے کا طعنہ نہیں دیا جا سکتا۔ وہ پنجاب کے متوطن نہ تھے انہوں نے بڑی ایمانداری سے کام کیا ہے۔ ''پنجاب میں اردو'' ہی نے محمود شیرانی کو اردو دنیا میں زندگی جاوید عطا کی ہے۔ اس کتاب کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے حافظ محمود شیرانی نے لکھا ہے کہ

> ''اس تالیف کا نام اس کے آخری باب ''پنجاب میں اردو'' کی رعایت سے رکھا گیا ہے۔ جو تمام و کمال پنجاب کے اردو گو شعرا کے ذکر و اذکار سے مملو ہے'' [1]

محمود شیرانی نے سب سے پہلے اس پونے دو سو برس کے عرصے کی لسانی اہمیت اجاگر کی ہے۔ جو فتح دہلی سے پہلے مسلمانوں نے پنجاب میں گزارا تھا۔ اردو اور پنجابی میں قریبی مشابہت سے شیرانی نے یہ نظریہ اخذ کیا کہ اردو کی بنیاد اس بولی پر قائم ہوتی ہے جو دہلی کی فتح کے وقت مسلمان پنجاب سے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

''پنجاب میں اردو'' میں انہوں نے اردو زبان کے سلسلے میں رائج تھیوری کو غلط ثابت کر کے اپنی نئی تھیوری سے اہل علم کو روشناس کرایا لیکن فوراً ہی تردیدیں شائع ہونے لگیں

اور کچھ ماہر لسانیات نے ان کے اس کام پر بھر پور وار کر کے اس تصور اور نظریہ کو پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔

شیرانی کا یہ نظریہ کہ اردو پنجابی سے ہے مکمل طور پر ان کا نہیں۔ اس کی جھلکیاں کئی ماہرین لسانیات کی تحریروں میں مل جاتی ہیں۔ کتابی صورت میں باقاعدہ تھیوری بنا کر پیش کرنے کا سہرا ان ہی کے سر بندھتا ہے۔ حافظ شیرانی گریرسن کے تعارف میں لکھتے ہیں کہ

''ان کو لسانیات ہند کا دیوتا کہنا موزوں معلوم ہوتا ہے۔ ان کی تالیف'' جائزہ لسانیات ہندوستان'' اور اس کی ضخیم مجلدات ان کے علم و فضل کی شاہد عادل ہیں'' ؏

محمد حسین آزاد کی آب حیات نے ایک عرصہ تک اردو لسانیات پر توجہ دینے والوں کو راستوں میں بھٹکائے رکھا۔ ہاں شیرانی کی کتاب'' پنجاب میں اردو'' صحیح راستے کے ، کی ایسی کوشش کہی جا سکتی ہے جو کامیاب رہی۔ لیکن بد قسمتی سے اسے صوبائی عصبیت افسانہ قرار دیکر غلط تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کے باوجود اردو لسانیاتی مطالعے پر ب میں اردو'' کے مثبت اور گہرے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

محمود شیرانی سے قبل اردو دنیا کی ادبی تحقیق ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی۔ نے اسے پائدار بنیادوں پر قائم کیا اور اس میں جدید مغربی اصولوں کو رواج دیا۔ نے ہمارے تحقیقی معیار کو بلند کرنے کے لئے اصلاحی تحقیق سے کام لیا ہے۔ اس ، ان کی ''تنقید شعر العجم'' اور ''تنقید آب حیات'' مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ حقیقت ، نہوں نے اپنی خدمات سے ہمارے علمی و تحقیقی معیار کو پستی سے اٹھا کر بلندیوں ۔ ں کیا ہے۔

اردو کے ارتقاء کے مقابلے میں جدید اردو شعر و ادب پر شیرانی کا کام نہ ہونے کے ے۔ ''تنقید آب حیات'' اور ایک حد تک ''تنقید دیوان ذوق'' کے حوالے سے انھو ں ضمن میں قابل قدر تحقیقی کام کیا ہے۔ آب حیات کی زبان کے وہ قدر دان اور ، اور آب حیات کے لئے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں مولانا آزاد کی محنت

شاقہ کے بھی وہ قائل تھے۔ محمد حسین آزاد کی کتاب آب حیات جب منظر عام پر آئی تو اس کی خوب قدر ہوئی۔ ساتھ ہی مخالفانہ تنقید بھی شروع ہوئی۔ محمد حسین آزاد نے اپنے ناقدین کے کچھ اعتراضات کو دوسری اشاعت میں دور کرنے کی کوشش بھی کی۔ وقت گزرتا گیا اور آب حیات پر تنقید میں اضافہ ہوتا گیا۔ آب حیات کے نقادوں میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، شیخ چاند اور مولانا عبدالحئی وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ ان لوگوں نے محمد حسین آزاد کو تحقیقی فرائض سے غفلت برتنے والا قرار دیا ہے۔ محمد حسین آزاد کے دفاع میں خود شیرانی نے حصہ لیا ہے۔ ۱۹۳۳ء ہی میں ان کا مرتبہ حکیم قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ ''مجموعہ نغز'' شائع ہوا۔ اس کے مقدمہ میں محمود شیرانی نے یہ انکشاف کیا کہ یہ تذکرہ محمد حسین آزاد کی مشہور تالیف آب حیات کا ایک اہم ماخذ ہے۔

محمد حسین آزاد نے آب حیات میں بعض جگہ مجموعہ نغز کے حوالے دیے ہیں، اکثر مقالات پر انہوں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ محمود شیرانی نے ''آب حیات اور مجموعہ نغز'' کے عنوان سے دونوں کتابوں کا تقابلی مطالعہ کر کے ایک مقالہ لکھا ہے کہ کن کن مقامات پر محمد حسین آزاد نے خوشہ چینی کی ہے۔

> ''نکات الشعراء اور ذکر میر کے چھپنے پر میر صاحب کے سلسلے میں مولانا بہت بدنام ہوئے مگر جب مجموعہ نغز شائع ہوا تو دنیا کو صاف معلوم ہو گیا کہ مولانا کے بیانات بے بنیاد نہ تھے'' [۳]

آغا باقر نے اپنے استاد محمود شیرانی سے آب حیات کا تنقیدی جائزہ لینے کی درخواست کی جسے انہوں نے منظور کر لیا۔ اس تنقید کی صرف تین ہی قسطیں شائع ہوئی تھیں کہ آغا باقر گھبرا گئے۔ اس لئے یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اس کے ڈھائی تین برس بعد دیوان ذوق پر اس وقت تنقید شروع ہوئی جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ چنانچہ حافظ محمود شیرانی نے دیوان ذوق پر تین حصوں ''تنقید دیوان ذوق مرتبہ آزاد''، ''دیوان ذوق پر آزاد کی اصلاحات'' اور ''دیوان ذوق پر آزاد کے اضافے'' پر مشتمل مقالہ لکھا۔ دوسرا اور

تیسرا حصہ تصحیح و تحقیق متن سے تعلق رکھتا ہے۔ جبکہ پہلا حصہ دیوان ذوق کے مقدمہ میں ذوق کی سوانح سے متعلق ہے۔ شیرانی نے آب حیات میں پیش کردہ سوانح ذوق کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا ہے۔

اردو زبان و ادب کی کوئی بھی تاریخ حافظ محمود شیرانی کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ ان کی مشہور تصنیف ''پنجاب میں اردو'' اپنی دیگر خوبیوں کے باوجود دو باتوں کے لحاظ سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ پہلے یہ کہ اس میں شیرانی نے اردو زبان کا مولد سرزمین پنجاب کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ شیرانی کا کہنا ہے کہ

''اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں'' [۳۴]

انہوں نے یہ دعویٰ بالکل نہیں کیا ہے کہ اردو زبان مکمل طور سے پنجابی زبان سے نکلی ہے بلکہ اردو کی بنیادی بولی وہ ہے جو فتح دہلی سے قبل مسلمانوں کے قیام پنجاب کے عرصے میں یہاں بولی جاتی تھی۔ مسلمان اسے اپنے ساتھ لے کر دہلی جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس میں امیر خسرو سے منسوب کتاب ''خالق باری'' کو ان کی تصنیفات سے خارج قرار دینے کے لئے نہایت مدلل، مفصل اور عالمانہ و محققانہ بحث کی ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو محمود شیرانی سے قبل متفقہ طور پر امیر خسرو کی تخلیق سمجھی جاتی تھی۔ اس کتاب میں مصنف نے عربی و فارسی الفاظ کو ہندی مترادفات کے ساتھ منظوم شکل میں پیش کیا ہے۔ امیر خسرو کے نام کے ساتھ اس کتاب کی نسبت کو محمود شیرانی خسرو کی توہین سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ اس میں اوزان و بحور کی غلطیاں بکثرت ملتی ہیں بہت سے الفاظ کے تلفظ اور لہجے غلط ہیں، بہت سے لفظ کے معنی غلط لکھے گئے ہیں اور بہت سے ایسے لفظوں کا استعمال بھی ملتا ہے جو امیر خسرو کے عہد کے نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے انہوں نے مولوی محمود امین چریا کوٹی کے ذریعہ ''جواہر خسروی'' میں پیش کی گئی مثبت دلیلوں کی تردید کی ہے، کیونکہ وہ

خالق باری کو امیر خسرو کی تصنیف مانتے ہیں۔ اس کے بعد محمود شیرانی نے اپنے اعتراضات پیش کیے ہیں۔

حافظ محمود شیرانی نے ''خالق باری'' میں پائی جانے والی خامیوں کو یکے بعد دیگرے بڑے واضح اور مدلل و مفصل انداز میں پیش کیا ہے۔ جن کے پیش نظر امیر خسرو کی طرف اس تالیف کا انتساب ان کی نظر میں امیر خسرو کی ہتک کی حیثیت رکھتا ہے۔ خالق باری پر محمود شیرانی کے اعتراضات کو دیکھ کر ان کی ذہانت اور علمیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

محمود شیرانی کہتے ہیں کہ اس کے مصنف کا نام ضیاء الدین خسرو ہے نہ کہ امیر خسرو۔ کیونکہ خالق باری ''حفظ اللسان'' کا ترجمہ ہے اور وہ حفظ اللسان کا مصنف ضیاء الدین خسرو کو مانتے ہیں۔ اگر ضیاء الدین خسرو کی تصنیف حفظ اللسان کو ہی خالق باری کی اصل صورت مان لیا جائے تو یہ لاعلمی اور بے انتہا حیرت انگیز قرار پائے گی۔ کوئی ایسی تصنیف جس سے صدیوں استفادہ کیا گیا ہو اور جس کی تقلید میں درجنوں تصنیفات وجود میں آئی ہوں۔ اس کے خالق کو اتنے کم عرصہ میں اس طرح بھلا دیا جائے کہ اس کی تصنیف بھی غلط طور پر کسی اور کے نام منسوب ہو جائے۔

ان سوالات کی روشنی میں شیرانی کی باتیں اور ان کی تحقیق لوگوں کو متاثر نہیں کرتی ہے۔ پھر بھی چند اعتراضات کے بعد ''خالق باری'' کی ترتیب، اس کی زبان، اشعار کے اوزان اور جا بجا الفاظ و معانی اور تلفظ الفاظ کی غلطیوں کی نشاندہی کر کے شیرانی نے اپنے دعوے کو مدلل بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔

خالق باری کی تدوین کے ضمن میں شیرانی کی متنی تحقیق و تاریخ کا کام معرکہ آرا ہے۔ انہوں نے خالق باری کے انتساب کے مسائل حل کرنے کے ساتھ اس کے متنی حدود قائم کرنے میں پوری پوری محنت کی ہے۔

حافظ محمود شیرانی نے اردو فارسی زبان وادب کے سینکڑوں موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور ہر موضوع پر اتنا نیا اور اچھوتا مواد فراہم کر دیا کہ اس سے ادبی تاریخ مالا مال ہوگئی

ہے۔ یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ ایرانیات میں مشرق میں اس پائے کا کوئی اور محقق نظر نہیں آتا۔ حافظ محمود شیرانی نے فارسی ادب کے اکثر ابتدائی مسائل پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ فارسی میں ان کا پسندیدہ موضوع فردوسی اور شاہنامہ فردوسی ہے۔ فردوسی پر انہوں نے چار مقالے لکھے ہیں، جو ''فردوسی پر چار مقالے'' کے نام سے موسوم ہے۔ پہلا مقالہ ''شاہنامہ کی پہلی داستان'' ہے اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ داستان بیژن و منیژہ سب سے پہلی داستان ہے جو منظوم ہوئی۔ اس داستان کے چند سال کے بعد شاہنامہ کا آغاز ہوا جو کئی سال کی طویل مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ داستان بیژن و منیژہ کی اولیت کے سلسلے میں انہوں نے کئی دلیلیں پیش کی ہیں۔ انہوں نے آخری اور بڑی محکم دلیل شہادت کلام سے پیش کی ہے اور یہی داخلی شہادت محمود شیرانی کی تحقیق کی جان ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ داستان بیژن و منیژہ کی زبان بقیہ شاہنامے کی زبان سے متفاوت ہے اور تفاوت تقدم و تاخر زمانی پر دال ہوتا ہے۔

''ہجو سلطان محمود غزنوی'' شیرانی کا دوسرا اہم مقالہ ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے پہلے اشعارِ ہجو میں ہر شعر کی اصل سے بحث کی ہے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کا ماخذ کیا ہے۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہجو کے اکثر اشعار مصنوعی اور جعلی ہیں۔ کچھ اشعار شاہنامہ میں دوسرے موقعوں پر کہے گئے تھے۔ ان کو ایک جگہ پیش کر کے ہجو کی روایت کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہجو کی روایت جب تراشی گئی تو چند ہی اشعار ہجو یہ متعین ہوئے۔ شیرانی نے ہجو کے اشعار پر تقریباً سو صفحے میں مفصل بحث کی ہے ۔اس کی بنیاد پر اس مقالہ کو ادبی تحقیق کا شاہکار سمجھا جاسکتا ہے۔

شیرانی نے تیسرے مقالہ میں فردوسی کے مذہب سے بحث کی ہے، کہا جاتا ہے کہ وہ شیعہ تھا اور سلطان محمود کٹر سنی۔ اس لئے فردوسی کو صلہ سے محروم رکھا گیا۔ یہ ایک مسلم حقیقت تھی جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ مگر شیرانی نے بڑی جرأت مندی کا ثبوت دے کر اس مسلم حقیقت کے خلاف آواز اٹھائی اور انہوں نے اس مسئلہ کو اس نتیجے

تک پہنچایا کہ جہاں تک داخلی شہادت کا تعلق ہے اس سے قطعی طور پر نہ اس کو شیعہ کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی سنی لیکن ان کے اکثر اشعار سے فردوسی کے سنی ہونے کا پتا چلتا ہے۔

شاہنامہ کے تعلق سے شیرانی کا سب سے اہم کارنامہ مثنوی یوسف زلیخا کے فردوسی کی انتساب کا بطلان ہے۔ فضلاء مغرب کی تحقیق نے اس پر ایسی مہر ثبت کر رکھی تھی کہ اس بارے میں کسی کو شک کرنے کا موقع نہ تھا۔ دور جدید کے اکثر نقاد مثنوی یوسف زلیخا کو فردوسی کی تصنیف نہیں مانتے۔ یہ آواز سب سے پہلے محمود شیرانی نے اٹھائی اور ایسے محکم دلائل پیش کئے کہ آج تک ان پر کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوسکا۔ انہوں نے یوسف زلیخا اور شاہنامہ کے کئی سو اشعار پیش کر کے دونوں کے فرق کو نمایاں کیا ہے۔ انہوں نے مثنوی یوسف زلیخا سے ایسے الفاظ، فقرات، محاورات، ترکیبات اور استعارات وغیرہ کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں جو فردوسی کے زمانہ میں وجود میں نہیں آئے تھے۔ شیرانی کے اس طریق استدلال سے ان کی تحقیق کا مرتبہ دوسرے محققین سے بلند ہو جاتا ہے۔

شیرانی کا فارسی ادب سے متعلق دوسرا اہم تحقیقی کارنامہ ''تنقید شعر العجم'' ہے۔ مغربی فضلا کی خدمات کے باوجود فارسی ادب کی اولین مبسوط اور باقاعدہ تاریخ علامہ شبلی کی ''شعر العجم'' قرار پاتی ہے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر تاریخ ادبیات فارسی نہیں بلکہ تاریخ ایران از روئے ادبیات فارسی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں جو مقام ''آب حیات'' کو حاصل ہے وہی مقام فارسی ادب کی تاریخ میں ''شعر العجم'' کو حاصل ہے۔ شبلی کو یہ اولیت حاصل ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے فارسی شاعری کو انتقادی نظر سے دیکھا ہے۔ شعر العجم کی تحقیقی خامیوں کو دور کرنے کی غرض سے محمود شیرانی نے ''تنقید شعر العجم'' لکھی۔ اس کتاب میں محمود شیرانی نے ''شعر العجم'' کی تحقیقی خامیاں دکھانے اور ان کی تصحیح کرنے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ حسب ضرورت تعمیری کام بھی کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ''شعر العجم'' بعض خصوصیات کے اعتبار سے اردو میں منفرد کتاب ہے لیکن اس میں تاریخی کمیاں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ شیرانی نے اس پر بھرپور تنقید کی ہے۔ محمود شیرانی اس

کتاب کی امتیازی حیثیت کو پوری طرح تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

''فارسی نظم کی تاریخ میں اردو زبان کی بے بضاعتی محسوس کر کے علامہ شبلی نے شعرالعجم تصنیف کی۔ اس موضوع پر اب تک فارسی اور اردو میں جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ شعرالعجم ان میں بغیر کسی استثناء کے بہترین تالیف مانی جاسکتی ہے'' ۵

تنقید شعرالعجم میں حافظ محمود شیرانی کا فن تحقیق نقطۂ عروج پر پہنچا ہوا ہے۔ محمود شیرانی تاریخ فارسی ادب پر گہری نظر رکھتے تھے اور فارسی زبان کے ارتقاء سے واقفیت رکھتے تھے۔ تنقید شعرالعجم میں ان کے انداز تحقیق کا جوہر پوری طرح عیاں ہے۔ داخلی شہادت یا خود شاعر کے کلام سے ثبوت کی فراہمی کے اعتبار سے فارسی کے تمام محققین میں وہ سب سے ممتاز اور نمایاں ہیں۔ تنقید شعرالعجم میں شعرالعجم کے متعلق ان کا نظریہ یہ ہے کہ

''علامہ شبلی اس تصنیف کے دوران میں مؤرخانہ ومحققانہ فرائض کی نگہداشت سے ایک بڑی حد تک غافل رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ شبلی تاریخ اسلام میں بہتر نظر رکھتے ہوں، لیکن شعرائے عجم کے حالات میں ان کے طاقتور قلم نے بہت لغزشیں کی ہیں۔ اس خاص دائرے میں ان کی معلوماتِ تاریخی نہایت محدود ہے اور نہ تمام سلسلہ شعرا، ان کے دواوین اور مآثر پر کافی عبور ہے'' ۶

یہ ایک اتفاق ہے کہ جس طرح ''تنقید آب حیات'' مکمل نہ ہوسکی تھی اسی طرح ''تنقید شعرالعجم'' بھی مکمل نہ ہوسکی۔ یہ عباس مروزی کے تذکرہ سے شروع ہوکر کمال اسماعیل کے تذکرہ پر ختم ہو جاتی ہے۔

تنقید شعرالعجم پر تبصرہ کرتے ہوئے مالک رام لکھتے ہیں کہ

''تنقید شعرالعجم کا ایک ایک صفحہ ان کے مطالعے کی وسعت، اسلامی تاریخ پر عبور، ذہانت اور نکتہ سنجی کا شاہد عادل ہے'' ۷

تحقیق کے طریقۂ کار میں جو چیزیں اہمیت کی حامل ہوتی ہیں ان میں سے ایک داخلی شواہد بھی ہے۔ شیرانی کی تحریروں میں داخلی شواہد کے اعلی ترین نمونے ملتے ہیں۔ ''پرتھی

راج راسا'' میں انہوں نے اسی طریقۂ کار یعنی داخلی شواہد سے مدد لے کر اس کی افادیت کو روشن کیا ہے اردو میں تحقیق پہلی بار اس طریق کار سے روشناس ہوئی۔ ان کی تحریروں کو سامنے رکھ کر ان کی تحقیقی روایت اور طریق کار کے دوسرے اجزا کی تفصیلات بہ خوبی معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے ''پرتھی راج راسا'' پر جو کام کیا ہے وہ اردو میں تحقیقی طریقۂ رسائی کے اعتبار سے ایک یادگار کام ہے، کہا جاتا ہے کہ پرتھوی راج کے ایک درباری ''چندر بردائی'' کی تصنیف ''راسا'' ہے۔ تاریخی اعتبار سے راجپوت خاندانوں کے زمانے اور نسب ناموں کے سلسلے میں وہ ایک نہایت قدیم ماخذ تسلیم کی جاتی ہے۔ جبکہ واقعہ کچھ اور ہی ہے۔

محمود شیرانی نے اس کتاب کے مندرجات کا جائزہ لے کر ان تمام روایتوں اور کتھاؤں کو نقل کر دیا ہے جو'' پرتھی راسا'' کے مشتملات کا حصہ ہیں۔ ان میں تاریخی حقائق کے ساتھ جو کھلواڑ کی گئی ۔ وہ اپنے طور پر خود ایک مثالی شکل میں سامنے آتی ہے۔ شیرانی سے پہلے بھی راسا کی تاریخی حیثیت پر شبہ کیا جانے لگا تھا۔ شیرانی نے لکھا ہے کہ ''راسا'' کے مرتبین نے تو راسا کے بیانات کے اعتماد پر مسلمان مؤرخین کو مطعون کیا کہ انہوں نے سلطان شہاب الدین کی زندگی کے ایسے تاریک پہلوؤں کو جو اس کے خلاف جاتے تھے قلم انداز کیا ہے۔

محمود شیرانی نے راسا کے بیان کردہ واقعات کو غلط قرار دینے اور ان کو من گھڑت ثابت کرنے کے لئے تاریخ و روایت کے تقابلی مطالعہ کو اس طرح پیش کیا کہ اخذ نتائج کی منزل تک خود اس کے قاری کا ذہن بآسانی پہنچ جائے۔

شیرانی نے اصطلاحات اسماء، خطابات اور اسلحہ وغیرہ کے سلسلے میں بھی تاریخی بحثیں چھیڑی ہیں اور ان کی بنیاد پر ''راسا'' کے ایک بہت بڑے حصے کو جعلی قرار دیتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ یہ باتیں بہت بعد کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں اور چندکوی کی فکر فرمائیوں سے ان کا کوئی رشتہ نہیں۔ اس کے علاوہ شیرانی کا مقالہ باغ و بہار سے متعلق اور شمس

العلماء عبدالغنی کی کتاب پر تبصرہ اور سکہ جات و کتبات پر ان کا کام لائق تحسین ہے۔

اردو کے تمام محققین اور کام کرنے والوں پر نظر ڈالیں تو اس سلسلے میں صرف چار محققین ممتاز نظر آتے ہیں۔ ایک تو سب سے پہلے حافظ محمود شیرانی جو خود بڑے محقق اور تنقید نگار تھے۔ ان کے بعد مولوی عبدالحق پر نظر پڑتی ہے۔ محققین کے اس صف میں تیسرے آدمی قاضی عبدالودود اور چوتھے امتیاز علی عرشی ہیں۔ جن کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

ہندوستان میں اردو اور فارسی کی نسبت سے حافظ محمود شیرانی کو تحقیق کا معلم اول کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے تحقیق کو مستقل موضوع کی حیثیت عطا کی اور اس اعتبار سے وہ روایت ساز تھے۔ ان کی تحقیقی زندگی کا آغاز ۱۹۲۰ء سے ہوتا ہے اور اس کا سلسلہ ۱۹۴۶ء میں ان کی زندگی کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے۔ انہوں نے تحقیقی مضامین مئی ۱۹۲۰ء سے لکھنا شروع کئے۔ ان کے تین ابتدائی مضامین ''شاہ نامے کی نظم کے اسباب اور زمانہ''، ''ہجو سلطان محمود غزنوی'' اور ''یوسف زلیخائے فردوسی'' خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ شیرانی کے اعلیٰ تحقیقی مقالے ہیں اور یہیں سے اردو میں حقیقی اور اعلیٰ تحقیقی انداز و اسلوب کا آغاز ہوتا ہے اور معیار و مقصود کی حد بندی ہوتی ہے، ''تنقید شعرالعجم'' کے عنوان سے شائع ہونے والے سلسلۂ مضامین نے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ عقیدت مندی اور شخص پرستی کی وجہ سے شدید ردعمل کا آغاز بھی ہوا۔

ان کی تحریروں میں ''داخلی شواہد کا تعین'' بکثرت ہے۔ ہجو سلطان محمود غزنوی، پرتھی راج راسا، خالق باری اور قصہ چہار درویش سے متعلق مقالات میں انہوں نے داخلی شواہد سے کام لیا ہے۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے زمین ہموار کی اور ناموافق حالات میں کام کا آغاز کیا۔ شیرانی کے مختلف مقالوں سے اصول تحقیق اور طریق کار کی تفصیلات مرتب کئے جاسکتے ہیں۔

محمود شیرانی نے اپنی کئی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ انہوں نے بہت سے غلط نظریات،

بگڑی ہوئی تاریخی حقائق کی درستی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اردو لسانیات کے میدان میں ''پنجاب میں اردو'' ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ انہوں نے تحقیق میں جدید مغربی اصولوں کو رواج دیا۔ اپنی خدمات سے تحقیقی معیار کو بلند کیا ہے۔ ان کی تنقید شعرالعجم اور تنقید آب حیات مثالی حیثیت رکھتی ہیں۔ تدوین متن میں بھی انہوں نے کام کیا ہے۔ تدوین متن کا کام قیام انگلستان ہی میں شروع کر دیا تھا۔ تدوین متن پر ان کا سب سے پہلا کام ڈاکٹر ہنری سٹب (Henry Stubbe) کی اسلام کے موضوع پر ایک انگریزی کتاب تھی۔ ان کا تدوین متن پر دوسرا کام حکیم قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ مجموعہ نغز کی تدوین ہے۔ جبکہ تیسری اہم تدوین خالق باری ہے۔ لیکن ان کی اصل دلچسپی تحقیق متن سے تھی۔ انہوں نے بالخصوص مختلف کتابوں کے زمانۂ تالیف اور ان کے مؤلفین و مصنفین کا تعین کیا ہے۔ علم عروض میں بلند مقام حاصل کیا۔ سکہ شناسی، خطاطی اور کتابت میں ماہر تھے۔

مختلف موضوعات پر لکھے گئے ان کے مقالات آٹھ جلدوں میں مرتب ہو چکے ہیں جن میں سے سات جلدیں مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کی ہیں۔ ان جلدوں میں ان کی شائع کی گئی اکثر کتابیں اور مقالے آ گئے ہیں۔ وہ ایک عظیم محقق اور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے۔ مگر ان کی شاعری باقاعدہ شاعری نہیں تھی۔ ہاں، ''ٹیپو سلطان'' جیسی نظموں اور بعض اردو فارسی غزلیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس فن میں بھی اپنا جوہر دکھا سکتے تھے۔

حوالہ جات

۱۔ پنجاب میں اردو، حافظ محمود خاں شیرانی، مکتبہ کلیاں بشیرت گنج، لکھنو، ۱۹۶۰ء، ص:۴

۲۔ پرتھی راج راسا، مرتبہ حافظ محمود خاں شیرانی، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، ۱۹۴۳ء، ص:۴۱۷

۳۔ مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد سوم، مرتبہ مظہر محمود شیرانی، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص:۴۱

۴۔ پنجاب میں اردو، ص:ب

۵۔ مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد پنجم، ص:۳۷۱

۶۔ تنقید شعر العجم، حافظ محمود شیرانی، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، ۱۹۴۲ء، ص:۲

۷۔ ''اردو میں تحقیق'' مشمولہ ''رہبر تحقیق'' مرتبہ سید شبیہ الحسن، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء

سید مسعود حسن رضوی ادیب

(۲۹ر جولائی ۱۸۹۳ء - ۲۹ر نومبر ۱۹۷۵ء)

سید مسعود حسن رضوی ادیب کا تعلق سادات کے ایک قدیم خاندان سے ہے۔ ان کے والد سید مرتضیٰ حسین پیشے سے حکیم اور عالم و فاضل تھے۔ سید مرتضیٰ حسین کی زندگی میں کبھی بھی خوش حالی نہیں آئی۔ تلاش معاش میں اناؤ کے ایک معروف قصبہ نیوتنی سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے بہرائچ آ گئے۔ بہرائچ ہی میں مسعود حسن رضوی ادیب کی ولادت ۲۹ر جولائی ۱۸۹۳ء کو ہوئی اس وقت ان کا نام محمد مسعود عرف ننھے رکھا گیا۔ مسعود حسن کو اپنا نام بچپن ہی سے ناپسند تھا اس لئے انہوں نے اپنا نام محمد مسعود کے بجائے سید مسعود حسن رکھ لیا۔ اس سلسلے میں ان کے بیٹے نیر مسعود لکھتے ہیں۔

> ''دراصل ان کو اپنا نام شروع ہی سے ناپسند تھا۔ ان کے والد، چچا اور دوسرے بزرگوں کے نام حسن یا حسین پر تھے۔ ان ناموں کے بیچ محمد مسعود انہیں بے جوڑ لگتا تھا۔ اس پر وہ کئی بار ماں سے الجھ چکے تھے کہ ان کا نام محمد مسعود کیوں رکھا گیا۔ آخرکار انہوں نے اپنا نام بدل ہی لیا اور ہائی اسکول کا امتحان اسی نام سے دیا'' [1]

ان کی ابتدائی تعلیم گھریلو رسم و رواج کے مطابق شروع ہوئی۔ رضوی ادیب اعلیٰ تعلیم

کے لئے مختلف جگہوں اور اداروں سے ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ دس سال کی عمر میں جب ان کے والد کا انتقال ہوگیا تو گھر کی مالی حالت مزید خراب ہوگئی۔ وسائل کی کمی کی وجہ سے حصول تعلیم کے دوران چھوٹی موٹی ملازمتیں کیں۔ انہوں نے اپنی تعلیم لکھنؤ یونیورسٹی میں مکمل کی اور اسی یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد ۱۵رجون ۱۹۵۴ء کو سبکدوش ہوئے۔ اپنی عمر کا بقیہ حصہ اردو زبان و ادب کی خدمت میں گزار کر ۲۹رنومبر ۱۹۷۵ء میں اس دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔

انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۱۸ء میں انگلستان کے مشہور شاعر لارڈ ٹینیسن کے منظوم افسانے اینک آرڈن کا سلیس اور بامحاورہ اردو میں ترجمہ کر کے کیا۔ جو دیباچے اور حاشیوں کے ساتھ ۱۹۲۰ء میں یونانی دواخانہ پریس، الہ آباد سے ''امتحان وفا'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس ترجمہ میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو ایک ترجمے میں ہونی چاہئیں۔ اس کتاب میں افسانے کے ترجمہ سے پہلے تین عنوانات ہیں، معذرت، گزارش اور دیباچہ، یہ تینوں عنوان ادیب کے اسلوب نگارش کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

''ہماری شاعری'' کے کئی ایڈیشن آچکے ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۷ء میں انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، دکن کے زیر اہتمام شائع ہوا، اس کی ہر اشاعت میں جگہ جگہ ترمیم و تبدیلی اور حذف و اضافہ کیا گیا ہے۔ تیسری اشاعت میں ادیب نے اہل علم حضرات کی فرمائش اور طالب علموں کی خواہش کے مطابق ''مصنف کی آپ بیتی'' بھی شامل کی ہے۔

ہماری شاعری سے مسعود حسن نے اپنی تنقید کا آغاز کیا۔ یہ کتاب معیار اور مسائل دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ۱۲۰ صفحات پر محیط مقدمے سے رضوی ادیب کے نقطۂ نظر، تنقیدی نظریات اور اسلوب تحریر کا پتہ چلتا ہے۔

> ''مصنف نے جس تفصیل، جس خوبی، جس شگفتگی، جس خوش اسلوبی اور جن مختلف پہلوؤں سے ہماری شاعری پر نظر ڈالی ہے اور جس طرح نگاہوں سے اوجھل نکتوں کو منظر عام پر لائے ہیں۔ وہ حد درجہ تحسین و داد کا مستحق ہے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اردو

شاعری کی تنقید و تبصرہ پر مقدمہ حالی کے بعد ہماری زبان میں یہ دوسری تصنیف ہے۔''[۲]

اردو تقریر و تحریر میں فارسی کے بہت اور عربی کے کم فقرے، جملے، مصرعے اور اشعار ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ادیب کی کتاب ''فرہنگ اقبال'' میں صرف وہ مثلیں ہیں جو اردو میں رائج ہیں، اس کتاب میں مثلوں کی مجموعی تعداد بارہ سو باسٹھ ہے جو حروف تہجی کی ترتیب کے لحاظ سے لکھی گئی ہیں۔ مثلوں کی ترتیب میں رکھے گئے لحاظ سے وضاحت کتاب کے دیباچہ میں کر دی گئی ہے۔ مثلوں کا با محاورہ اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار شانتی پریس، الہ آباد سے ۱۹۲۸ء میں چھپی ہے۔

میر تقی میر کا نادر الوجود رسالہ ''فیض میر'' مدت دراز سے پوشیدہ رہا۔ ادیب نے اس رسالہ کو مرتب کر کے شائع کیا۔ اس کتاب میں فارسی زبان میں پانچ حکایتیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ حکایتیں میر کی فارسی اسلوب بیان اور انشاء پردازی کا نمونہ ہیں۔ ادیب نے اس کتاب کا اردو میں خلاصہ لکھا ہے بلکہ یوں کہہ لیں تو زیادہ بہتر ہوگا کہ انہوں نے اس کا آزاد اردو ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ ادیب کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اسے پڑھ کر میر کے مزاج کا علم ہوتا ہے۔ تصوف اور الہیات کے مسائل پر میر کی دلچسپی کا بھی علم ہوتا ہے۔ رضوی ادیب نے ۲۲ صفحات پر مشتمل ایک ایسا مقدمہ لکھا ہے جس میں تحقیقی اور تنقیدی دونوں پہلو نمایاں ہیں۔ انہوں نے فیض میر کی اہمیت اور میر کی نثر کی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ اس رسالے کو میر نے اپنے بیٹے فیض علی کے لئے لکھا تھا۔ اس مناسبت سے اس کا نام فیض میر رکھا۔

سعادت یار خاں رنگین دہلوی نے اپنی سیاحت کے دوران مختلف شہروں میں شاعروں اور ادیبوں سے شعر و شاعری سے متعلق جو دلچسپ گفتگوئیں اور ناقدانہ بحثیں کی تھیں، ان کو ادیب نے ''مجالس رنگین'' میں جمع کر دیا ہے۔ رنگین کے بارے میں بہت سی باتیں جو اس کتاب میں لکھی ہوئی تھیں۔ مرتب نے ان کو مناسب ترتیب سے یکجا کر کے

ایک مسلسل اور مربوط بیان کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ اس کتاب میں رنگین کی نثر نگاری، شاعری اور ریختہ گوئی وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔ ادیب نے تفصیلی مقدمہ کے ساتھ اس کتاب کو مرتب کر کے شائع کیا۔ اس مقدمہ میں رنگین کے تفصیلی حالات، ان کی طبیعت، دوسرے شاعروں کے کلام کی پسندی اور ناپسندی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ کتاب میں مجلسوں کی کل تعداد باسٹھ ہے۔ آخری مجلس میں رنگین کے دس شاگردوں کا بھی ذکر ہے۔ کتاب کے شروع میں تصنیفات رنگین کے نام سے ان کی اکتیس کتابوں کے نام بھی لکھے گئے ہیں۔

سید انوار حسین آرزو لکھنوی کی لکھی ہوئی کتاب نظام اردو کی شرح ادیب نے لکھ کر یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ سے ۱۹۳۱ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں دو دیباچے ہیں، ایک مصنف کا اور دوسرا ادیب کا۔

اس کتاب میں جگہ جگہ توضیحی حاشیے لکھے ہوئے ہیں۔ کتاب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حاشیوں کی عبارت کتاب کے متن سے بہت زیادہ ہے۔

ادیب نے اپنی کتاب ''روح انیس'' کے مقدمہ میں پہلے امام حسین کی شہادت کا مختصر حال لکھا ہے۔ اس کے بعد مرثیہ کی تعریف، اس کے اجزائے ترکیبی پھر ان لوگوں کے ضروری حالات لکھے گئے ہیں، جن کا ذکر مرثیوں میں اکثر آتا ہے۔ اس کے بعد انیس کے حالاتِ زندگی لکھ کر ان کی شاعری پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔ مشکل الفاظ کی فرہنگ اور مشکل مقامات پر حاشیے لکھ کر یہ دونوں چیزیں کتاب کے آخر میں شامل کر دی گئی ہیں۔ روح انیس میر انیس کے بہترین مرثیوں، سلاموں اور رباعیوں کا مرقع ہے۔ روح انیس کے دیباچے میں رضوی ادیب لکھتے ہیں۔

> ''میر انیس کے تمام کلام کو پڑھ کر جو مرثیے، سلام اور رباعیاں بہترین معلوم ہوئیں۔ ان میں سے سات مرثیے، پندرہ سلام اور پینتیس رباعیاں ایک جلد کے لئے منتخب کیں۔ ایک ایک مرثیے کے جتنے جتنے قدیم اور معتبر قلمی نسخے فراہم ہو سکے۔ ان کا باہمی مقابلہ کر کے، ہر مرثیے کی تصحیح کی'' [۳]

''جواہر سخن'' اردو شعراء کے کلام کا انتخاب ہے جسے محمد مبین کیفی چریا کوٹی نے چھ جلدوں میں ترتیب دیا ہے۔ دوسری جلد پر نظر ثانی کی ذمہ داری ادیب کے سپرد کی گئی۔ نظر ثانی کرتے وقت انہوں نے زیادہ تر ترمیم و حذف سے کام لیا ہے۔ عبارتوں میں لفظی ترمیم کی گئی ہے۔ بعض شعراء کے خصوصیات کلام کو از سر نو لکھا گیا ہے۔ اس جلد میں اڑتیس شعراء کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔

مطبوعہ نسخوں میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں، ادیب نے کتاب پر سرسری نظر ڈال کر ان غلطیوں کی فہرست کتاب کے آخر میں ''صحت نامہ جواہر سخن جلد دوم'' کے نام سے شامل کردی ہے۔ دیباچہ کے بعد خصوصیات دور جلد دوم میں لکھا ہے۔

میر انیس کے لا جواب مرثیے ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' کو ''شاہکار انیس'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ ادیب نے کتاب کے شروع میں ایک عالمانہ مقدمہ اور آخر میں توضیحی اور تنقیدی حاشیے لکھے ہیں۔ کتاب کے مقدمہ میں اس مرثیہ کا جو تجزیہ پیش کیا گیا ہے وہ نفسیاتی بصیرت، تنقیدی شعور اور حسن بیان کا ایک نادر مرقع ہے۔ جس میں صبح کا منظر، گرمی کی شدت، گھوڑے کی تعریف، مراثی انیس میں اخلاقی تعلیم اور مراثی انیس کے لئے معیار تنقید پر بالتفصیل بحث کی گئی ہے۔

''فائز دہلوی اور دیوان فائز'' کے ذریعہ ادیب نے فائز دہلوی کو متعارف کرایا۔ کتاب کے شروع میں ماخذوں کی فہرست اور آخر میں فرہنگ پیش کی گئی ہے۔ ادیب نے فائز کے آباء و اجداد کا تفصیلی حال بیان کیا ہے۔ یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے اس کتاب سے فائز کے ساتھ ان کے شعری محرکات، ہم عصر شعراء، فائز کے عہد اور حزیں، زٹلی، آبرو، حاتم اور عطا وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہے۔

ادیب فائز کو شمالی ہند میں اردو کا سب سے قدیم صاحب دیوان شاعر قرار دیتے ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ فائز کو عربی زبان اور ادب پر بھی عبور حاصل تھا۔ فائز نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں اشعار کہے ہیں۔ ادیب کی

جانفشانی اور کوششوں کی بدولت اردو ادب و شعر کے مؤرخ فائز اور ان کی تصانیف سے باخبر ہوئے۔ فائز دہلوی اور دیوان فائز کیلئے ادیب کو جس طرح دیدہ ریزی اور محنت کرنی پڑی اس کے بارے میں خود لکھتے ہیں۔

''فائز کے خاندان کی کڑیاں جوڑنے میں جو دقتیں پیش آئیں اور اس کے لئے جتنی محنت کرنا پڑی اس کا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا۔۔۔ فائز کے اردو دیوان کی قرأت، تصحیح اور تحشیہ بھی اچھا خاصا صبر آزما کام نکلا۔ متروک اور نامانوس الفاظ کے علاوہ اس کے رسم خط کی بعض خصوصیتوں نے اس کا پڑھنا دشوار کردیا تھا۔ بڑی دیدہ ریزی اور مغز کاری کے بعد بھی چند لفظ صحیح نہیں پڑھے جا سکے'' [۴۴]

مسعود حسن رضوی نے فائز کی زندگی کے ہر گوشے کو بیان کیا ہے۔ یہ رضوی ادیب کا بہت بڑا کام ہے اسے قاضی عبدالودود جیسے محقق نے بھی جلدی کسی کی تعریف نہیں کرتے سراہا ہے۔

ادیب نے مرزا غالب کے غیر مطبوعہ مکتوبات و منظومات کو ''متفرقات غالب'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب مکتوبات اور منظومات دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں غالب کے وہ مکتوبات ہیں جو انہوں نے کلکتہ میں مقیم اپنے دوستوں کو لکھے تھے اور منظومات ایسی ہیں جو انہوں نے خود کلکتہ کے زمانے میں لکھی تھیں۔

ادیب کی کتاب ''اردو زبان اور اس کا رسم خط'' تقسیم ملک کے وقت چھپی۔ کتاب کے پہلے حصہ میں اردو زبان کی تاریخ، اس کے ترکیبی عناصر، اس کی تمدنی اور قومی اہمیت اور اس کی صوتی خصوصیات پر ایک تبصرہ ہے۔ جبکہ دوسرے حصہ میں اردو رسم خط اور اس کے سلسلے میں پیدا ہونے والے مسائل پر مدلل بحث ہے۔ تقسیم ملک کے بعد اردو کے خلاف سازشیں رچی گئیں۔ وعدوں کے باوجود اردو کو اس کا حق نہیں دیا گیا تو اردو کو اس کا حق دلانے کے لئے شدید احتجاجی سلسلے شروع کئے گئے۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

''آب حیات'' کے بارے میں لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ محمد حسین آزاد نے اس

کتاب کو بغیر تحقیق کے لکھی ہے اور وہ بغیر تحقیق کے لکھتے تھے۔ ادیب نے ''آب حیات کا تنقیدی مطالعہ'' میں اس بات کو ثابت کیا ہے کہ مولانا پر لگائے گئے الزامات غلط ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں ''آب حیات'' پر کیے گئے اعتراضات کے جواب دیئے ہیں اور تلاش و تحقیق، دلائل اور معتبر حوالوں سے محمد حسین آزاد پر لگائے گئے الزامات کو رد کیا ہے ساتھ ہی محمد حسین آزاد کی غلطیوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔

ادیب کی لکھی گئی کتاب ''رزم نامہ انیس'' بارہ سو چون بند کی بلند پایہ نظم مراثی انیس کے بہترین اقتباسات کی فنکارانہ ترتیب کا نتیجہ ہے، جس میں امام حسین کی ولادت سے شہادت تک کے واقعات کا تفصیلی بیان بہتر سے بہتر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رزم نامہ کیوں مرتب کیا گیا اور اس کی ترتیب میں کون سے اصول ملحوظ رکھے گئے ہیں۔

ادیب نے دیوان غریب کو ''تذکرۂ نادر'' کے نام سے نئی ترتیب کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا۔ اس کے مقدمہ میں اعتصام الدولہ میر مرزا کلب حسین خان بہادر مبارز جنگ نادر کے حالات زندگی کو تحقیق کے ساتھ لکھا ہے اور ایک سو اکتالیس شعراء کا کلام مختصر سوانح حیات کے ساتھ پیش کیا ہے، جبکہ دیوان غریب میں نادر نے تقریباً پانچ سو شعراء کا تذکرہ کیا ہے۔

''فسانۂ عبرت'' مرزا رجب علی بیگ سرور کی لکھی ہوئی کتاب ہے جسے ادیب نے از سرنو مرتب کیا۔ اس کتاب کے دیباچہ میں سرور کی تصنیف و تالیف اور ترجمہ کی ہوئی کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ادیب نے فسانہ عبرت میں پائے جانے والے تمام نقائص کو دور کیا اور جو چیزیں کتاب کے موضوع سے تعلق نہ رکھتی تھیں، انہیں حذف کر دیا۔ اس کا تمہیدی حصہ الگ کر کے کتاب کے آخر میں ضمیمے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ادیب نے اسے نئی ترتیب کے ساتھ شائع کر کے اردو ادب اور تاریخ میں اضافہ کیا ہے۔

''لکھنؤ کا شاہی اسٹیج'' ادیب کی لکھی ہوئی ایک کتاب ہے جس کے مضامین مختصراً یہ

ہیں۔ ڈرامے سے پہلے تفریحی مشغلوں میں ڈرامائی عنصر، اردو کا پہلا ڈرامہ واجد علی شاہ کے قلم سے، اردو ڈرامے کا پہلا اسٹیج، شاہی محل میں شاہی ڈرامے کے اداکار، پوشاکیں، زیور اور دوسرا ساز وسامان، تین اور شاہی ڈرامے، قیصر باغ کا جوگیا میلہ۔

کتاب کا سبب تالیف ادیب نے یہ بتایا ہے کہ ڈرامے کے بارے میں جو غلط فہمیاں عام ہوگئی تھیں ان کا ازالہ کیا جائے۔ کتاب میں اسٹیج کی تاریخ، اس کی تہذیبی و معاشرتی اہمیت اور اس کے مختلف فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ابتدائی صفحات میں پس منظر کے عنوان سے ڈرامے کی ابتداء پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ادیب نے ڈرامے کے آغاز کے سلسلے میں مغربی محققین کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر طاہر تونسوی رقم طراز ہیں۔

> ''یہ کتاب لکھنؤ کے شاہی اسٹیج کے بارے میں بھرپور معلومات دینے کے ساتھ ساتھ لکھنوی تہذیب اور تمدن کے بارے میں گرانقدر پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے اور یوں مسعود حسن رضوی کے حسن ترتیب اور تحقیق وجستجو کی داد دینا پڑتی ہے۔ یہ کتاب اردو ڈرامے کے ارتقاء کے سلسلے میں خاصی اہمیت کی حامل ہے۔'' ۵

ادیب نے رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۷ء کے شمارہ میں ایک مقالہ ''اندر سبھا اور شرح'' کے عنوان سے شائع کیا اور انہوں نے ان غلط قیاسات کی تردید کی جسے محمد عمر نور الٰہی نے اپنے مضمون ''ہندوستان کا ڈراما'' میں اندر سبھا کے بارے میں قائم کیا تھا۔ ادیب نے اس سے متاثر ہو کر ''امانت اور اندر سبھا'' پر تحقیق شروع کردی جو ''لکھنؤ کے عوامی اسٹیج'' کی شکل میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں امانت لکھنوی کے حالات وتصنیفات، امانت کی مرثیہ گوئی، امانت کی واسوخت، امانت کے دیوان، ان کی نثر نگاری، اندر سبھا کی مقبولیت اور اس کے تتبع میں لکھے گئے ناٹک اور سبھا کی تفصیل، اندر سبھا کا مکمل متن اور متعلقہ مباحث پر ادیب نے قابل قدر ذخیرہ فراہم کیا ہے۔

ادیب کی یہ کتاب اعلیٰ، انتہائی محنت اور تحقیق کا ثمرہ ہے۔ اس کو تفصیل سے بیان کر

کے ادیب نے اندر سبھا کی ادبی اور فنی منزلت کو نمایاں کیا ہے۔

''اردو ڈرامہ اور اسٹیج'' میں لکھنؤ کا شاہی اور عوامی اسٹیج دونوں شامل ہیں اس کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ فنون لطیفہ کے سرپرست، اردو ڈرامے کے موجد، اردو اسٹیج کے بانی اور اسٹیج کی ہندوستانی روایتوں کے پابند تھے اور جن سے کتاب کا سبب تالیف اور مواد کی جستجو وغیرہ کا حال معلوم ہوتا ہے۔

ادیب نے اردو ڈرامے کا آغاز، اس کے عناصر ترکیبی، اس کی ارتقائی منزلیں، اس کا اسٹیج اور اسٹیج کا ساز و سامان اور اس کے اداکار وغیرہ کو انتہائی تحقیق سے تمام امکانی تفصیلات کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ادیب نے جب ہماری شاعری اور جوہر آئینہ شائع کی تو کچھ لوگوں نے ان کتابوں پر تنقید و تبصرے کئے، جس کے دفاع میں ادیب کے مضامین ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے اور یہی مضامین ''آئینہ سخن فہمی'' کے نام سے شائع ہوئے۔

''تذکرہ گلشن سخن'' میر کاظم مردان علی مبتلا کا ناقص تذکرہ ہے دوسرے تذکروں کی طرح اس کی زبان فارسی ہے۔ کتاب میں شاعروں کے مختصر حالات اور ان کے کلام کا انتخاب زیادہ ہے۔ یہ کتاب تین سو اکیس شاعروں کے حالات اور ان کے منتخب اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ کتاب میں بعض نثر نگاروں کا بھی ذکر ہے۔

ادیب نے مولوی عبدالحق کی خواہش کے مطابق اس تذکرہ کو مرتب کر کے شائع کیا۔ ادیب نے امکان کی حد تک کتاب کو مکمل کر کے مبسوط تحقیقی مقدمہ اور کئی فہرستوں، انڈکسوں اور اشاریوں کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

''ایرانیوں کا مقدس ڈراما'' بھی ادیب کے ادبی تحقیق میں انتہائی انہماک اور محنت کا نتیجہ ہے۔ اس موضوع پر نہ کسی ایرانی مصنف نے تحقیق کی زحمت کی اور نہ ہی کسی یورپی مستشرق نے۔ ادیب نے کتاب کی ابتداء میں تعزیہ، شبیہ گردانی، تکیہ پیشن، مریکل، مسٹری کی اصطلاحوں کی وضاحت کر دی ہے۔ کتاب میں واقعات کربلا کو ڈرامہ کے انداز میں

پیش کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس خاص نوعیت کے ایرانی ڈرامے کی ابتداء، ترقی اور تنزلی کا مفصل حال وغیرہ کا پتہ چلتا ہے۔ کتاب کے آخری حصہ میں تعزیے کے زوال کے اسباب پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

تین جز کے کتابچے ''شاعر اعظم انیس'' کے اہم عنوانات میں میر انیس، مختصر تعارف، ان کی شاعری، ممتاز اہل قلم کا خراج تحسین، اشخاص مرثیہ کا مختصر تعارف، منتخب کلام انیس، آخری عنوان کے تحت چودہ رباعیوں، بارہ سلاموں کے منتخب اشعار اور مرثیوں کے ستائیس اقتباسات پیش کئے گئے ہیں۔ اس کی ترتیب ادیب کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ انیس کی سیرت، شخصیت اور کمال مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی وغیرہ کو اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ادیب نے قواعد کلیہ بھا کھا کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا جو رسالہ نقوش میں ۱۹۶۰ء میں ''برج بھاشا کی پہلی گرامر'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ بعد میں یہی ترجمہ ایک مختصر مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا۔ ادیب نے اس کتاب کے دیباچہ میں تحفۃ الہند کے مقدمہ کے سات باب اور ایک خاتمہ کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ مقدمہ میں دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں دیونا گری حروف اور رسم الخط کا بیان ہے دوسرے حصہ میں بھا کھا کے قواعد کلیہ ہیں۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ برج بھاشا کی گرامر اس سے قبل کسی نے نہیں لکھی۔

ادیب نے منشی خادم حسین افسوس کی کتاب ''ناٹک بزم سلیمان'' کو اپنے تحقیقی مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا۔ مسعود حسن رضوی کے اس تحقیقی مقدمے سے متعلق پروفیسر انیس اشفاق لکھتے ہیں۔

> ''اپنے عالمانہ مقدمے میں مسعود حسن رضوی نے اس ناٹک کی خوبیوں اور خصوصیتوں پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے بارے میں بعض غلط فہمیوں کو بھی دور کیا ہے۔ نیز افسوس کے بارے میں سوانحی معلومات بھی فراہم کئے ہیں۔'' ۶

افسوس نے ناٹک بزم سلیمان امانت کی اندر سبھا کے دس سال بعد لکھا اور اس کے تمام جزئیات و تفصیلات میں اندر سبھا کی پیروی کی۔ لیکن ان دونوں ناٹکوں کے کردار

یکساں نہیں ہیں۔

ادیب کی لکھی گئی کتاب ''نگارشات ادیب'' ادیب کے انیس مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب کے شروع میں نورالحسن ہاشمی سے نشریہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ ۱۶ر دسمبر ۱۹۶۲ء کی ادیب کے ساتھ ایک ادبی ملاقات بھی پیش کی گئی ہے، جس سے ادیب کی زندگی کی ابتداء، ان کی مطبوعہ کتابیں، ان کے ادبی کام اور ان کے طریق کار وغیرہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

''اسلاف میر انیس'' میں میر انیس کی سات پشتوں کے تحقیقی حالات ہیں، کتاب تعمیری تحقیق کے قدر شناسوں کے نام معنون کی گئی ہے۔ ابتداء میں ماخذوں کی لمبی فہرست ہے جو ادیب کی غیر معمولی کاوش کا ثبوت ہے۔

غالب کے اردو دیوان کی بہت سی شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔ ان میں نظم طباطبائی کی شرح کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے نہایت اہم تنقیدی بیانات شرح کے تین سو صفحات میں بکھرے ہوئے ہیں جن کو ادیب نے ان کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر ان منتشر بیانات کو محاسن کلام اور معائب کلام کے دو بابوں میں مناسب عنوانوں کے تحت جمع کر دیا ہے۔

ادیب کی تصنیف ''سلطان عالم واجد علی شاہ اختر'' ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی، جو ان کی محنتوں کا ثمرہ ہے۔ اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ پر انگریزوں کے لگائے گئے الزامات کی تردید اسی کتاب کے ذریعہ ادیب نے کی ہے۔

ادیب نے واجد علی شاہ کی چھیالیس تصنیفات کی فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے کی ہے، جس سے بادشاہ کے شوق تصنیف و تالیف اور علمی استعداد کا پتا چلتا ہے۔

اگر ادیب کے ذاتی کاغذات اور ڈائریوں کو دیکھا جائے تو ہمیں وہ بے شمار معلومات حاصل ہوں گی جنہیں ادیب نے یادداشت کے طور پر جمع کیا تھا۔ اس سے ان کے علمی انہماک اور توجہ کا دائرہ کتنا وسیع تھا معلوم ہوتا ہے، انہوں نے اپنی تصانیف اور تالیفات میں ان یادداشتوں سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔

ادیب اپنی علمی و ادبی مشغولیت کے باوجود دیباچہ یا پیش لفظ لکھنے سے گریز کرتے تھے۔ کتابوں پر تبصرہ بہت کم لکھتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ادیب کا ذہن جن مسائل اور موضوعات میں الجھا ہوا تھا وہ اپنی تمام تر توجہ انہی کے لئے وقف رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی میں بہت سے تنقیدی و تحقیقی مقالات، کتابوں پر تبصرے، صنف مرثیہ اور مرثیہ گو شعراء سے متعلق مضامین، غالبیات، واجد علی شاہ، لکھنویات، ناٹک اور ڈرامے کے علاوہ علمی و ادبی موضوعات پر بے شمار مضامین لکھے جو متعدد رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔

ادیب کو بعض امور میں اولیت حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی تقریباً تین درجن کتابوں اور بیسیوں مقالوں میں مختلف موضوعات پر بحث کی ہے۔ مگر ان کے دو خاص موضوع رہے ہیں۔ ایک مرثیہ کی تاریخ اور انیسیات، دوسرے لکھنؤ کے شاہی زمانے کے آخری دور کی تاریخ بالخصوص واجد علی شاہ کا عہد۔ بنیادی طور پر وہ ایک محقق تھے۔ انہوں نے ادب اور تحقیق کے مطالعہ میں زندگی گزاری ہے۔ لیکن مشرقی اور مغربی ادبیات کے سرمائے سے علمی دلچسپی نے انہیں ایک تنقیدی نظر بھی عطا کی تھی۔ وہ اپنے کلچر اور روایات کے تقاضوں کو سمجھتے تھے۔ شعر کا ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ ان کی تحقیق میں تنقیدی عناصر واضح طور سے پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اردو تنقید کی روایت کو مشرقی خطوط پر آگے بڑھایا۔ ان کا تنقیدی طریقۂ کار مکتبی ہوتے ہوئے بھی ادب شناسی کے مذاق کو عام کرنے میں مددگار ثابت ہوا۔

ادیب کی طبیعت کا رجحان ادب پارے کی تنقید و تحقیق میں مکمل معلومات کی فراہمی اور اس کے استدلالی پہلو پر زور ہے۔ جس سماجی اور سیاسی ماحول میں ادیب کے شعور کا ارتقاء ہوا وہ بڑی ابتری کا شکار تھا۔ انگریزوں کے اثرات ہر شعبۂ حیات پر نمایاں تھے۔ ادیب مغرب سے متاثرہ جدید تنقید کی بعض خوبیوں کے قائل ہیں۔ لیکن مشرقی ادبیات کو مغربی تنقید کے اصولوں پر جانچنے کے قائل نہیں ہیں۔

ادیب کی تنقیدی کارناموں میں سب سے پہلے ان کی کتاب ہماری شاعری کا نام لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تحقیقی تصنیفات کے مقدموں میں بھی ان کی تنقیدی نظریہ کا اظہار ہے، ادیب کی تنقید نگاری کا سب سے بڑا وصف اس کا مثبت پہلو ہے۔ انہوں نے اپنی ذہنی تعمیر کی طرح اپنے تنقیدی اسلوب کی تعمیر میں مولانا اسماعیل میرٹھی اور محمد حسین آزاد کی مثال سامنے رکھی۔

ادیب کسی مخصوص مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس مقصد کے حصول کے لئے تحقیق کرتے ہیں اور تحقیق کے نتیجے میں جو حقائق دریافت ہوتے ہیں۔ ان کی بنیاد پر اپنے مقصد کی عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ اگر دوسروں کی غلطیوں کا اظہار ضروری ہوتا ہے تو نرم لہجے میں کرتے ہیں۔

ادیب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تحقیق کے ساتھ تنقید کو بھی نگاہ میں رکھتے ہیں اور کسی فن پارے کو تحقیق کے ساتھ پیش کرتے ہوئے اس کی قدر و قیمت اور اس کے مقام کا تعین بھی کرتے ہیں، تحقیق و تنقید کا یہ توازن بہت کم محققین کے یہاں نظر آتا ہے۔ ان کے مضامین سلجھے ہوئے اور واضح تحقیق کی بہترین مثال ہیں۔

رضوی ادیب کی تحقیق نگاری سے متعلق ڈاکٹر طاہر تونسوی لکھتے ہیں۔

''مسعود حسن رضوی ایک ممتاز محقق اعلیٰ تحقیقی مزاج رکھنے والے اور اردو تحقیق کے اہم ترین سنگ میل اور ستون ہیں۔ ان کے معیار تحقیق پر ان کے سوا کوئی اور پورا اترتا دکھائی نہیں دیتا اور یہی ایک منفرد اور بڑے محقق کی پہچان اور شناخت ہے۔۔۔ انہوں نے تعمیری تحقیق کی جو روایت قائم کی ہے آج کی موجودہ تحقیق ان کے دکھائے ہوئے راستوں پر چل رہی ہے۔'' ؎

ان کی زبان اور محاورے کے رموز و نکات پر گہری نظر ہے۔ ان کی زبان سادہ و سلیس اور انداز سائنٹیفک ہے۔ ادیب نے شائستگی، سنجیدگی، لطافت اور حسن خیال کو اسلوب نگارش کے بڑے حسین پیکر میں سموکر پیش کیا ہے۔ ان کی طرز تحریر میں ان کی

طبیعت کی پوری نفاست جھلکتی ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ

"بیان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کہنے والا جو کچھ کہے، سننے والا وہی سمجھے، آسانی سے سمجھے اور اس کے سوا کچھ اور نہ سمجھے، دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ سننے والے کو بیان میں ایسی لذت ملے کہ وہ اس کو پوری توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنتا رہے۔" [۸]

ادیب نے شاعری بھی کی ہے اور یہ شوق انہیں بچپن ہی سے تھا۔ انہوں نے بچپن میں بیت بازی کے لئے ایک ڈائری بھی بنا رکھی تھی۔ مگر تحقیق نگاری ہی نے ان کو بام عروج تک پہنچایا اور خاص و عام میں مقبول کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب، ذات و صفات، مرتبہ مالک رام، ص ۵۳

۲۔ معارف، اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۲۹ء

۳۔ روح انیس، مسعود حسن رضوی ادیب، انڈین پریس، الہ آباد، طبع اول، ۱۹۳۱ء، ص:۲

۴۔ فائز دہلوی اور دیوان فائز، مرتبہ مسعود حسن رضوی، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۶۵ء، ص:۵۔۴

۵۔ مسعود حسن رضوی ادیب حیات اور کارنامے، ڈاکٹر طاہر تونسوی، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص:۱۶۲

۶۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب، انیس اشفاق، ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۵ء، ص: ۷۷

۷۔ مسعود حسن رضوی ادیب حیات اور کارنامے، ص:۲۱۲-۲۱۱

۸۔ ہماری شاعری، مسعود حسن رضوی، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، دکن، ۱۹۷۱ء، ص: ۲۵

نصیرالدین ہاشمی

(۱۸۹۵ء-۱۹۶۴ء)

دکن میں اردو زبان و ادب اور تحقیق کے حوالے سے کئی نام لئے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم نام نصیر الدین ہاشمی کا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی ۱۵؍مارچ ۱۸۹۵ء کو حیدر آباد کے معروف محلے ترپ بازار میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبد القادر عالم و فاضل تھے۔ انہیں تفسیر، حدیث، فلسفہ اور دوسرے علوم میں مہارت حاصل تھی۔ نصیر الدین ہاشمی نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ دینیات، ریاضی اور خطاطی جیسے علوم استاد سے حاصل کی۔

نصیرالدین ہاشمی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں خاندانی روایت کے مطابق زمانہ طالب علمی ہی سے علم و ادب سے بڑی دلچسپی رہی ہے۔ والد کے انتقال کے بعد تعلیم و تربیت کی ذمہ داری نانا نے لی اور ۱۹۱۱ء میں مدرسہ دارالعلوم میں داخلہ کرالیا۔ وہ علمی اور ادبی دلچسپیوں کی وجہ سے ایک عرصہ تک دارالعلوم کی یونین ''ثمرۃ الادب'' کے سکریٹری رہے۔ اور ''ثمرۃ الادب'' کے نام سے ایک علمی رسالہ شائع کرتے رہے۔ ان کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی ہے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر کم و بیش دو درجن کتابیں لکھی ہیں۔ ہاشمی نے دکنی ادب، تاریخ اور خواتین دکن

کے علمی وادبی اور سماجی خدمات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے چند تصانیف قابل ذکر اور لائق تحسین ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی کی دکھنی ادب پر تصانیف بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ہاشمی دکنیات پر لکھنے والوں میں ایک منفرد اور الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب ''دکن میں اردو'' انفرادی مقام رکھتی ہے۔ یہ کتاب کئی بار چھپ چکی ہے اور اس کی ہر اشاعت میں اضافے ہی ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی کا آخری ایڈیشن بہت ہی ضخیم ہے۔ یہ کتاب مستند کتابوں کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔

نصیر الدین ہاشمی کی یہ کتاب تاریخ ساز علاقائی اور تاریخی کتابوں میں پہلی کتاب ہے۔ اس کے ساتھ دکن کے ادیب اپنی تمام آب و تاب کے ساتھ منصۂ ادب پر نمودار ہوئے۔ اس سلسلے کی دوسری کڑی ''مدراس میں اردو'' ہے یہ کتاب بھی کافی مقبول ہوئی۔ مگر اردو ادب کی دنیا میں جو مقام اور رتبہ ''دکن میں اردو'' کو ملا اس تصنیف کو نہ مل سکا۔

ڈاکٹر زور کی ''اردو شہ پارے'' دکنیات کی دوسری اہم کتاب ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف نمونے دیے گئے ہیں بلکہ ادیبوں کے حالات زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ آج بھی ان دونوں تصانیف کی اہمیت مسلم ہیں۔ دکن میں اردو جو کہ پہلی علاقائی تاریخ ادب ہے، اسی طرز پر متعدد مؤرخین اور محققین نے مختلف علاقائی تاریخیں لکھی ہیں۔ ''پنجاب میں اردو'' بھی دکن میں اردو کی تقلید میں لکھی گئی ہے جسے علاقائی تاریخ کے طور پر محمود شیرانی نے پیش کیا ہے۔ اس کتاب کو تاریخی نہیں بلکہ لسانیاتی حیثیت سے شہرت دوام ملی۔ اس میں آغاز اردو سے متعلق ایک اہم نظریے کو پیش کیا گیا ہے۔ ''پنجاب میں اردو'' علاقائی تاریخ ادب کی حیثیت سے ناقص اور غیر مکمل ہے۔ شیرانی کی یہ کتاب لسانی اعتبار سے بہت ہی اہم ہے۔

'دکن میں اردو' میں ان اصحاب کے کلام کو بھی پیش کیا گیا ہے جو دکنی نہیں تھے بلکہ یہاں آکر رہائش اختیار کرلی تھی اور یہیں مدفون ہوئے۔ اس کتاب میں نصیر الدین ہاشمی نے تحقیق وتنقید کا زبردست نمونہ پیش کیا ہے۔

نصیرالدین ہاشمی نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے۔

''میں نے جو کچھ لکھا ہے مستند کتابوں سے لکھا ہے۔ اگرچہ ابتدا میں میرا ارادہ ایک مختصر مضمون لکھنے کا تھا لیکن جب میں نے لکھنا شروع کیا تو مضمون طویل ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ ایک کتاب کی سی صورت ہوگئی۔ اس کتاب میں میں نے ان اصحاب کے کلام کو بھی پیش کیا ہے جو دکھنی نہیں تھے بلکہ یہاں صرف بود و باش اختیار کرلی تھی اور یہیں پیوند زمین ہوئے''۔ ۱

دکن میں اردو کی اشاعت کے بعد حیدرآباد کی حکومت نے انہیں اسی موضوع پر مزید تحقیق کے لئے انگلستان اور یورپ بھیجا۔ جس کا نتیجہ ''یورپ میں دکھنی مخطوطات'' ہے۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات صرف مخطوطات کی فہرست نہیں بلکہ ایک تحقیقی کارنامہ ہے۔

کسی بھی زبان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سارا ادب پیش نظر رہے۔ مگر اردو ادب پھیلا اور بکھرا ہوا ہے۔ جس پر گرفت بہت مشکل ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ کتابوں اور کتب خانوں کی مکمل وضاحتی فہرستیں تیار کرکے شائع کردی جائیں۔ اس کام کے لئے حکومت حیدرآباد نے نصیرالدین کو دکنی مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کرنے کے لئے منتخب کیا۔ یہ چیز یورپ میں ایک سائنس کی صورت اختیار کرچکی تھی۔ بہرکیف انہوں نے جدوجہد کرکے انڈیا آفس کے دکنی قلمی کتابوں کی فہرست ''یورپ میں دکھنی مخطوطات'' کے نام سے شائع کی۔ یہ کتاب خاصا مقبول ہوکر اپنی اہمیت تسلیم کروا چکی ہے۔

ان کی ایک اور کتاب ''دکھنی ہندو اور اردو'' دلچسپ اور معلومات آفریں ہے۔ اس تصنیف سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ بیسیوں ہندو شعراء اور ادیب اردو کی خدمت میں کمربستہ تھے۔ مرد ہی نہیں عورتیں بھی اس میدان میں شانہ بہ شانہ نظر آتی ہیں۔ اس کتاب میں اردو کے ہندو ادیبوں اور شاعروں کی طویل فہرست اور ان کے مختلف کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ اردو

زبان کسی فرقے، طبقے یا کسی مذہبی گروہ کی مخصوص زبان نہیں۔ سرزمین دکن میں اردو زبان میں لکھنے والوں میں ہر طبقے اور مذاہب کے لوگ شامل ہیں۔ دکن میں اردو کے ہندو شاعروں اور ادیبوں کی تعداد دوسرے گروہوں کے لکھنے والوں سے کچھ کم نہیں۔ اس کتاب میں پیش کئے گئے ادیبوں، عالموں اور شاعروں میں سے اکثر ایسے ہیں جن کے کارنامے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہاشمی نے اس کتاب میں بڑی تلاش اور جستجو سے مواد اکٹھا کیا ہے۔

کتابوں کی وضاحتی فہرست پر ان کی خدمات بکثرت ہیں۔ انجمن ترقی اردو نے حیدرآباد کے کتب خانوں کی قلمی اردو کتابوں کی وضاحتی فہرست مرتب کرنے کی ذمہ داری نصیرالدین ہاشمی کو سونپی۔ ڈیوی (Dewy) نے کتب خانوں کی ترتیب اور فہرستوں کو مرتب کرنے کے جو اصول بنائے تھے۔ تقریباً سبھی نے اس کی پابندی کی ہے مگر نصیرالدین ہاشمی نے ڈیوی کے اصولوں کی مکمل طور سے پابندی نہیں کی۔ اس اصول کے اختیار کرنے میں کسی قدر ترمیم بھی کر دی ہے۔ انہوں نے ابواب کی تقسیم ڈیوی کے اصول کے مطابق ضرور کی ہے مگر ان کو مقدم و مؤخر کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ کتابوں کے لحاظ سے کچھ اور ترمیمات کی ہیں۔ ہر باب کے تحت کئی کئی فن شامل کئے گئے ہیں۔ نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں نہ صرف بہمنی، قطب شاہی، عادل شاہی اور آصفی دور کی کتابیں ہیں بلکہ دربار لکھنؤ، رام پور اور دہلی کے اساتذہ اور مصنفین کا قلمی ذخیرہ بھی موجود ہے۔ لکھنؤ سے متعلق واجد علی شاہ جان عالم کی بھی تصانیف موجود ہیں۔ اس کتب خانہ میں اردو تاریخ نویسوں کے لئے بڑا قیمتی سرمایہ موجود ہے۔ ''کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست'' میں نو ابواب مقرر کئے گئے ہیں۔ نواب کے اس کتب خانہ میں تقریباً دس ہزار قلمی کتابیں تھیں۔ یہاں کے اردو قلمی کتابوں پر نظر ڈالنے سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلے یہ کہ بعض کتابوں کے ایک سے زیادہ نسخے موجود تھے۔ جن سے کئی امور ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ قطب شاہی، عادل شاہی اور مغلیہ دور کے کئی جدید شعراء کی

تصانیف ہیں۔ان شعراء اور ان کی تصنیفات کا علم ہاشمی کے اس کام سے پہلے کسی مؤرخ ادب کو نہیں تھا۔ تیسرا قابل ذکر امر یہ ہے کہ کئی شعراء اور مصنفین کی نئی تصانیف کا علم ہوتا ہے جو اس سے قبل گم نام تھیں۔ ان امور کے علاوہ بیسیوں شعراء اور مصنفین کی تصانیف سے واقفیت ہوتی ہے۔ ہاشمی نے اس کتاب (اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست) کے ساتھ ایک جامع مقدمہ بھی لکھا ہے۔جس میں ضروری معلومات پیش کی گئی ہیں۔ یہ کتاب بھی ''یورپ میں دکھنی مخطوطات'' اور ''کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات جلد اول'' کی طرح دو سال میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔

اسٹیٹ سنٹرل لائبریری، حکومت آصفیہ کے دور میں کتب خانہ آصفیہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ کتب خانہ اہل علم، محققین، ریسرچ اسکالرز اور عوام وخواص کے استفادہ کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اس لائبریری میں مختلف زبانوں پر مشتمل کتابیں یکجا کی گئی تھیں۔ حکومت آصفیہ کے ختم ہو جانے کے بعد اس کا نام ''اسٹیٹ سنٹرل لائبریری'' رکھا گیا۔

نصیرالدین ہاشمی نے کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات پر اس وقت کام شروع کیا تھا جب اس لائبریری میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ کتابیں تھیں۔ انجمن ترقی اردو نے یہ کام ہاشمی کے سپرد کیا۔ یہ کام نہایت ہی اہم اور مشکل ہونے کے باوجود خوش اسلوبی سے انجام پذیر ہوا۔اس کام کو مکمل کرنے میں دو سال کا عرصہ لگا کیونکہ کسی ایک شخص کے لئے مختلف علوم و فنون سے کتابوں کو حاصل کرنا کتابوں کے صفحات کی گنتی کرنا، شکستہ اور بوسیدہ تحریروں کا پڑھنا اس کے علاوہ کتاب کے متعلق دیگر معلومات حاصل کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ نصیرالدین ہاشمی اس کتاب کو ترتیب دینے کے دوران پیش آنے والی دقتوں سے متعلق لکھتے ہیں۔

''اس کام کے انجام دینے کے لئے مجھے کئی دقتیں پیش آئیں۔ مثلاً مختلف فنون سے کتابوں کو حاصل کر کے جدید اصول کے لحاظ سے ان کا اندراج کرنا، تمام کتابوں کے صفحات کی گنتی کرنا، شکستہ اور زشت خط کو پڑھنا۔ ان کتابوں کے متعلق دیگر معلومات

حاصل کرنا، تنہا ایک شخص کے بس سے باہر تھا اور پھر کم سے کم مدت میں اس کو مرتب کرنا تھا۔ بہر حال دو سال میں یہ فہرست مرتب ہوئی تھی، اس وقت اس میں (۸۸۲) اردو قلمی کتابوں کی صراحت کی گئی تھی'' ۲

''کتب خانہ آصفیہ اسٹیٹ سینٹرل لائبریری حیدرآباد آندھرا پردیش کے اردو مخطوطات'' دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی پہلی جلد میں سات ابواب یعنی ادبیات، تاریخ، سائنس، علوم عمرانیات، فلسفہ، لسانیات اور مذاہب و ہندی کتابوں میں ان سے متعلق کتابوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جبکہ دوسری جلد میں اسلامیات اور تکملہ فنون کی صراحت کی گئی ہے۔ انہوں نے کتابوں کو کافی حد تک سن اشاعت کے لحاظ سے ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر وہ کتابیں جن کی سن اشاعت معلوم نہیں ہوتی ان کے سن کا تعین ارتقاء زبان کے لحاظ سے کر کے لکھا ہے۔ ان تصانیف کے علاوہ انہوں نے کئی اور یادگار تصانیف چھوڑی ہیں۔ جن میں چند نجم الثاقب (فقہ شافعی ۱۹۲۴ء)، سلاطین دکن کی اردو شاعری (۱۹۲۳ء)، خیابان نسواں (۱۹۲۸ء)، خواتین دکن کی اردو خدمات (۱۹۴۰ء)، عہد آصفی کی قدیم تعلیم (۱۹۴۶ء)، جنگ آزادی کی کہانی (۱۹۴۷ء) اور زبیدہ کے دیس میں (سفر نامۂ عراق) ہیں۔

نصیرالدین ہاشمی کو تالیفات و تصنیفات کے علاوہ مضمون نگاری کا بھی بڑا شوق تھا۔ مضمون نگاری کا یہ شوق مرتے دم تک باقی رہا۔ ان کے مضامین متعدد رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ''مقالات ہاشمی'' اور ''دکھنی کے چند تحقیقی مضامین'' نصیرالدین ہاشمی کے ان ادبی اور تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں جو مختلف اوقات میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مضامین کے لکھے جانے کا مقصد اردو زبان و ادب کی خدمت ہے۔ انہوں نے ''مقالات ہاشمی'' میں شامل تنقیدی مضامین لکھتے وقت یہ بات مدنظر رکھی تھی کہ تنقید و تحقیق کا اصلی مفہوم فوت نہ ہو جائے۔ مقالات ہاشمی میں شامل مختلف مضامین خواجہ بندہ نواز کی ہندوستانی شاعری، بہمنی حکومت کا ایک دکھنی شاعر، نورس مصنفہ ابراہیم عادل شاہ ثانی، خاور

نامہ دکھنی، سلطان علی عادل شاہ ثانی کا ہندوستانی کلیات، ولی کے پہلے دکن کی اردو شاعری، ولی کا غیر مطبوعہ کلام (یورپ کے دواوین سے)، ولی کا غیر مطبوعہ کلام (ایک خاندانی مخطوطہ سے)، وجہی مرثیہ گو کی حیثیت سے، دکن کے بعض مرثیہ گو، مرزا کے مرثیے، ارسطو جاہی، ہندوستانی قصیدے، شعرالہند اور دکن، انڈیا آفس کی کیٹلاگ میں دکھنی مخطوطات کی فروگذاشتیں، اردو سروے کمیٹی کی رپورٹ کی چند قابل توجہ فروگذاشتیں، تاریخ نثر اردو ادب پر ایک تنقیدی نظر، اردو لٹریچر (مصنفہ ڈاکٹر بیلی) اور رسالہ اردو، مغل اور اردو پر ایک سرسری نظر، جواہر سخن پر ایک نظر، فتوت کا تذکرہ شعرائے اردو، تمنا کا تذکرۂ شعراء، کیمبرج کے ہندوستانی مخطوطات کی فہرست اور پیرس کے ہندوستانی مخطوطات کی فہرست وغیرہ ہیں۔ جو مختلف اوقات میں رسالہ ہندوستانی، معارف، مکتبہ حیدرآباد، ادبی دنیا، شہاب، رہبر دکن، ہزار داستان، جامعہ اور شاہ جہاں وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

نصیرالدین ہاشمی ساری زندگی کسی صلے یا عوض کی پروا کئے بغیر اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ انہوں نے دکن میں تحقیق کے لئے راہ ہموار کی اور نظروں سے اوجھل نوادرات کو منظر عام پر لائے۔ نصیرالدین ہاشمی تحقیقی کام بہت ہی دلچسپی اور لگن سے کرتے تھے۔ اس سلسلے میں سیدہ جعفر رقمطراز ہیں۔

> ''ادب کی گمشدہ کڑیوں کے بازیافت اور ادب کے ان جواہر پاروں کو منظر عام پر لانے جو مرور زمانہ کی گرد وغبار میں نظر سے اوجھل ہو گئے تھے، نصیرالدین ہاشمی نے جس محنت، لگن، تحقیقی ذوق وشوق اور شیفتگی سے کام کیا ہے اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے'' ؎

نصیرالدین ہاشمی ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت کا نام ہے جس نے اپنی ساری زندگی اردو کی خدمت کی۔ ان کا اسلوب ہمیشہ عام فہم رہا۔ انہوں نے اپنی تمام تصانیف اور دیگر مضامین میں سلیس، سادہ اور عام فہم زبان استعمال کیا ہے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ تحقیق جیسے خشک موضوع کے لئے سہل زبان کا استعمال سودمند ہوگا۔ ہاشمی کے زندۂ جاوید کارنامہ

''دکن میں اردو'' کو جب علامہ اقبال نے دیکھا تو ان کے انداز بیان اور طرز تحریر کے علاوہ اس عظیم الشان کارنامہ سے بے حد متاثر ہوئے۔ ان کی یہ کتاب علامہ اقبال کو بہت پسند آئی۔ چنانچہ انہوں نے ایک تعریفی خط بھی لکھا۔ کلیات مکاتیب اقبال میں سید مظفر حسین برنی لکھتے ہیں۔

> ''انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور فرانس کے مختلف کتب خانوں میں دکن کے سینکڑوں مخطوطات کی ورق گردانی کی اور تیرہ ماہ بعد موادلیکر لوٹے اور اپنی مشہور تحقیقی تصنیف ''دکن میں اردو'' (۱۹۲۳ء) لکھی، ۱۹۲۵ء میں ہاشمی صاحب نے اپنی تصنیف کا پہلا ایڈیشن اقبال کی خدمت میں روانہ کیا۔ اقبال نے بغور مطالعہ کرنے کے بعد اپنے خط محررہ ۷رمئی ۱۹۲۵ء میں اس کی بہت تعریف کی ہے'' [۴]

ان کی تحریروں میں سادگی و پرکاری بکثرت ہے۔ انداز بیان میں صفائی، چستی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ وہ جو بھی کہتے ہیں صاف اور واضح طور پر کہتے ہیں تاکہ بآسانی سمجھ میں آسکے اور اثر انداز ہو۔

حوالہ جات

۱۔ دکن میں اردو، نصیرالدین ہاشمی، انشا پریس، لاہور، ۱۹۶۰ء، ص: ۷

۲۔ اردو مخطوطات کتب خانہ آصفیہ، جلد ۱، نصیرالدین ہاشمی، مطبع ابراہیمیہ، حیدرآباد، دکن، ۱۹۶۱ء، ص: ۲

۳۔ تاریخ ادب اردو، جلد سوم، سیدہ جعفر، وی۔ جی۔ پرنٹرس، دلسکھ نگر، حیدرآباد، ۲۰۰۲ء، ص: ۲۳۱

۴۔ کلیات مکاتیب اقبال، جلد دوم، سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص: ۱۰۸۱-۱۰۸۲

مولانا غلام رسول مہر

(۱۳راپریل ۱۸۹۵ء - ۱۶رنومبر ۱۹۷۱ء)

غلام رسول مہر کی پیدائش ۱۳راپریل ۱۸۹۵ کو جالندھر پھول پور میں ہوئی۔ ان کے والد چودھری محمد علی خان ناخواندہ تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے غلام رسول مہر کو ایسی تعلیم دلائی جس کی وجہ سے وہ زندگی کے مختلف میدانوں میں نمایاں اور کامیاب وکامران رہے۔

ان کی تعلیم کا آغاز عام رسم ورواج کے مطابق مدرسہ سے ہوا۔ غلام رسول مہر ابھی گیارہ ہی برس کے ہوئے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ مرتے وقت ان کے والد نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کی وصیت کی تھی۔ غلام رسول مہر چار بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے۔ اگر مرتے وقت ان کے والد نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کی وصیت نہ کی ہوتی تو شاید یہ بھی اپنے والد کی طرح ان پڑھ رہ جاتے۔

پرائمری درجات پاس کرنے کے بعد مشن ہائی اسکول جالندھر میں داخلہ لیا۔ اسی زمانے میں غلام رسول مہر شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔ میٹرک کے بعد انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور پانچ سال کے بعد بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے طالب علمی کے زمانے ہی سے غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینا شروع کردیا

تھا۔ جن میں ان کی شاعری، کالج میں ہونے والے مباحثوں میں شرکت اور کرکٹ کا کھیل قابل ذکر ہے۔ مولانا مہر جن شخصیات سے متاثر ہوئے ان میں علامہ اقبال، ظفر علی خاں اور ابوالکلام آزاد کے نام قابل ذکر ہیں۔ مولانا مہر ''الہلال'' کے ایڈیٹر کے علاوہ ''حزب اللہ'' اور ''تحریک نظم جماعت'' کے قائد رہ چکے ہیں۔

بی اے کی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد گئے اور وہاں وقار الدولہ کے محکمۂ تعلیمات کے انچارج بنے۔ پھر ۱۹۲۰ء میں ملازمت ترک کر کے پھول پور واپس آ گئے۔ اس وقت ہندوستان میں تحریک خلافت عروج پر تھی۔ مولانا مہر بھی اس سے متاثر ہوئے اور جالندھر میں اس تحریک کے سکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اسی دوران ان کے ایک دیرینہ دوست پروفیسر عبدالقادر شاہ نے انہیں لاہور بلوالیا۔ کیونکہ روزنامہ ''زمیندار'' میں ایڈیٹر کی جگہ خالی تھی۔ اس روزنامہ میں سول نافرمانی کے موضوع پر انہوں نے اپنا پہلا مقالہ ''طلوعِ صبحِ امید'' کے عنوان سے لکھا۔ یہ مقالہ روزنامہ زمیندار میں قسط وار چار دن تک شائع ہوتا رہا۔ غلام رسول مہر نے تقریباً ساڑھے پانچ سال بعد زمیندار سے علاحدگی اختیار کر لی۔ اس کے بعد ''انقلاب'' نام کے ایک روزنامہ کا اجراء کیا۔ مولانا مہر علامہ اقبال سے بے حد متاثر تھے اسی لئے یہ نام علامہ اقبال کی مشہور نظم ''انقلاب اے انقلاب'' سے لیا ہے۔ اب مولانا مہر کا شمار صحافیوں اور وقتی مسائل پر قلم اٹھانے والوں میں ہونے لگا۔ مولانا مہر کو اپنی زندگی میں کئی واقعات پیش آئے۔ جوان کی زندگی میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ بیماری کے دنوں میں مولانا مہر پہلی مرتبہ محقق کی حیثیت سے سامنے آئے۔ انہیں دنوں مکتوبات غالب کے انداز میں ''غالب'' کے نام سے ایک کتاب اس طرح تدوین کی کہ انہیں کے خطوط سے ان کی سوانح عمری تیار ہو گئی۔

''غالب'' کی اشاعت نے ان کے لئے تحقیقی اور تصنیفی کامیابیوں کے در کھول دیے۔

مولانا مہر اور عبدالمجید سالک کے درمیان بہت ہی اچھے تعلقات رہے۔ یہ دونوں بہت ہی اچھے دوست تھے۔ جب یہ دونوں روزنامہ زمیندار سے الگ ہوئے تو اس وقت یہ

فیصلہ کیا کہ اب صحافتی دنیا سے الگ رہ کر علمی و ادبی کام کریں گے۔ بہر کیف ''انقلاب'' کے بند ہو جانے کے بعد اپنی تمام تر توجہ علمی و ادبی کاموں کی طرف مرکوز کر دی اور بقیہ ساری زندگی اسی مشغلے میں مصروف رہے۔ ہاں وقت کے تقاضے کو مدنظر رکھتے ہوئے تین ماہ کے لئے روزنامہ ''آفاق'' سے منسلک ہوئے۔ ان کی صحت آخری ایام میں بہت اچھی رہی۔ گرچہ کئی برس پہلے مختلف بیماریوں میں مبتلا رہے۔ یہی بیماریاں ان کی موت کا سبب بنیں۔ بالآخر بروز منگل ۱۶ رنومبر ۱۹۷۱ء کو ان کا انتقال ہوا۔

انہوں نے اپنی زندگی میں افغانستان، لندن، فلسطین، فرانس اور حجاز کا سفر سیر و سیاحت کی غرض سے کیا۔ اندرونِ ہند میں حیدرآباد دکن اور بیرون ہند میں حجاز کا سفر اہمیت سے خالی نہیں۔

مولانا مہر اچھے، نیک، منکسر المزاج، دیانت دار، مذہبی اور شریعت کے مطابق زندگی گزارنے والے انسان تھے۔ کبر و غرور نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہ تھی، وہ اپنے آپ کو معصوم اور گناہوں سے پاک تصور نہیں کرتے تھے۔ اپنی زندگی کی طرح تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی دیانتداری سے کام لیا۔ مولانا مہر اپنی زندگی میں دیانت دار تھے، دیانتداری سے کبھی ناطہ نہیں توڑا۔ مولانا مہر جہاں دنیاوی معاملات میں دیانتدار نظر آتے ہیں وہیں تصنیف و تالیف میں بھی دیانتداری سے کام لیتے ہیں۔

مولانا مہر صحافی، سوانح نگار، مؤرخ، محقق، شارح اور ترجمہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے ہر میدان میں کارہائے نمایاں انجام دے کر صف اول کے ادیبوں میں اپنا نام درج کرایا ہے۔

''سیرت امام ابن تیمیہ'' مولانا مہر کی پہلی تصنیفی کوشش ہے۔ انہوں نے اسے مستقل کتاب کے طور پر نہیں لکھا تھا بلکہ امام ابن تیمیہ کی ایک عربی کتاب کے ترجمہ کے لئے بطور مقدمہ لکھا تھا۔ جسے بعد میں کتابی شکل دے دی گئی۔

''غالب'' مولانا مہر کی یہ سوانحی کتاب عام روش سے ہٹ کر ہے، کیونکہ یہ کتاب

''غالب'' خود غالب کی تحریروں سے ہی اس کی سرگذشتِ حیات مرتب کی گئی ہے۔ اس کی خصوصیات پر ڈاکٹر سید عبداللہ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

''سوانح نگاری کے تقاضے بھی باحسن وجوہ پورے کئے ہیں۔ ضروری مواد کی فراہمی، اس میں سے بذریعہ انتقاد معنی خیز اور مفید مطلب، جزئیات کا انتخاب، شخصیت کی نقش گری، احساس تکمیل اور شعور صداقت ہر شے اس سوانح عمری میں موجود ہے۔''

مولانا غلام رسول مہر مسلم لیگ کے سخت حامی تھے۔ مسلم لیگ کا نظریہ اور پیغام دور تک پہنچانے کے لئے ایک رسالہ لکھا۔ جس کا نام ''سیاسیات اسلامیان ہند'' ہے جو ۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ جو اس مقصد سے لکھا گیا تھا کہ اسلامی ممالک تک مسلم لیگ کی آواز پہنچائی جائے۔ اسی لئے اس رسالہ کا مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا۔ اسے مولانا سالک نے شائع کرایا۔

''آزادی کی جنگ'' مولانا مہر اور سالک نے مل کر مرتب کیں۔ اس میں دوسری جنگِ عظیم کے اسباب و محرکات کے علاوہ جنگ کے ابتدائی دنوں کی جو کیفیت تھی پیش کی گئی ہے۔ اس تاریخی کتاب کو ملک احسان الٰہی نے شائع کیا ہے۔

''جوزیفین'' نپولین بوناپارٹ کی پہلی بیوی جوزیفین کی سوانح عمری ہے۔ جسے شیخ نیاز احمد نے شائع کیا۔ اس کتاب میں سوانح کے اتار چڑھاؤ اور مختلف ڈرامائی واقعات کے علاوہ مولانا مہر کا اسلوب بیان کتاب کی دلکشی میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ کتاب جوزیفین کی سوانح عمری ہے اس کے باوجود نپولین ہر جگہ چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ اس میں مستند تاریخی واقعات کے ساتھ ایک ایسی کہانی بھی ہے جس میں انسانی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔

''مختصر تاریخ اسلام'' کے مطالعہ سے اسلامی تاریخ کا ہر دور سامنے آجاتا ہے۔ در اصل یہ کتاب بچوں کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی تھی۔ اسے شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے طبع کیا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر نے سید احمد شہید کے سلسلے میں تین کتابیں لکھی ہیں ان کا پہلا

زندہ جاوید سوانحی کارنامہ ''سید احمد شہید'' ہے۔ ''سید احمد شہید'' پہلی مرتبہ ۱۹۵۴ء میں
یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں سید کے آباء و اجداد، خاندان، پیدائش،
و تربیت، دعوتِ اصلاح کا آغاز اور سفرِ حج وغیرہ کے علاوہ بعض ابتدائی معرکوں اور جنگو
تک کے حالات ہیں اور دوسرے حصہ میں ہزارہ کے محاذ سے لے کر سید صاحب
شہادت، ان کے اخلاف، ازدواج و اولاد اور اخلاق و عادات کا بیان ہے۔ مولانا مہر
اس کتاب میں تاریخ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے بہت محنت کی ہے۔ تحقیق و تاریخ
کے ساتھ واقعات کو پیش کرنے میں استدلالی اور منطقی انداز اپنایا ہے۔ مولانا غلام رسول مہ
نے اس کتاب کے ذریعے صرف ایک شخص کی سرگزشت ہی نہیں بلکہ ایک تحریک کی
سرگزشت پیش کر دی ہے۔ وہ خود ہی اپنی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''یہ ایک شخصیت کی سیرت ہی نہیں بلکہ ایک نہایت اہم دینی تحریک کی مفصل سرگزشت
ہے جو اس عاجز کے محدود علم کے مطابق پاک و ہند کی اسلامی تاریخ میں یگانہ تحریک
تھی'' [۱]

اس سلسلے کی دوسری اہم کتاب ''جماعت مجاہدین'' ہے جو کہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔
پہلے حصہ میں تنظیم کے اغراض و مقاصد، اس کے طریق کار اور اس تنظیم کی بدولت افراد و
شخصیات میں آنے والی تبدیلیوں اور انقلابات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جب کہ دوسرے حصہ
میں مختلف اکابر اور جماعت سے وابستہ افراد کی سوانح و شخصیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس
بارے میں مولانا مہر خود رقم طراز ہیں۔

''ان اکابر رفقاء کے سوانح حیات جو سید صاحب کی زندگی میں یا ان کے ساتھ شہید
ہوئے یا جنہوں نے بعد ازاں جہاد میں کوئی حصہ نہ لیا۔'' [۲]

''سرگزشت مجاہدین'' اس سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ جو کہ سات حصوں میں منقسم
ہے۔ اس کے مقدمے میں مولانا مہر لکھتے ہیں۔

''سید احمد شہید کے سلسلے کی یہ تیسری اور آخری کتاب ہے۔ اس پر وہ اختتام کو پہونچا،

جس کے لئے سروسامان اور تگ و تاز میں میری زندگی کے کم و بیش بیس سال صرف ہوئے۔'' ۳

''خطوط غالب'' میں غالب کے زیادہ سے زیادہ خطوط کو یکجا کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مکتوب الیہم کے حالات زندگی اور غالب سے ان کے تعلقات کی وضاحت ہے، خطوط غالب میں خطوط کو تاریخی اور زمانی ترتیب سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

''۱۸۵۷ء'' میں ۱۸۵۷ء کے خونی جنگوں کی تفصیلات ہیں۔ مولانا مہر نے ۱۸۵۷ء کے واقعات کو ایک سوانح نگار کے بجائے مؤرخ کی حیثیت سے لکھا ہے۔ اس میں ان کی تاریخ نویسی کی تمام خوبیاں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ ان کی تاریخ نویسی کی سب سے اہم خوبی محققانہ انداز ہے۔ جو اس میں موجود ہے۔ مولانا مہر جب بھی کوئی بات لکھتے ہیں یا کوئی دعویٰ کرتے ہیں تو تحقیق و تدقیق سے کام ضرور لیتے ہیں بلا تحقیق کوئی بھی بات نہیں کہتے اور نہ ہی کوئی دعوی کرتے ہیں۔

''۱۸۵۷ء کے مجاہد'' میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے واقعات اور انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے والوں کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب میں ۲۳ سے زائد مجاہدین کی سوانح حیات ہے۔ اس کے علاوہ بزرگانِ دیوبند کے نام سے ایک الگ باب بھی قائم ہے۔

''تاریخ سندھ'' مخصوص موضوعات کے بعد مولانا مہر کی یہ سب سے اہم تاریخی تصنیف ہے۔ تاریخ سندھ کے مقدمہ میں مولانا مہر لکھتے ہیں کہ

''اس موضوع پر یہ پہلی مفصل اور مستند کتاب ہے۔ کہیں کہیں قیاس سے بھی کام لینا پڑا۔ لیکن یہ قیاس محکم حقائق پر مبنی تھا۔ اس لئے امید ہے انشاء اللہ درست ثابت ہوگا۔'' ۴

اس میں انہوں نے ماضی کے مردہ واقعات کا صرف ذکر ہی نہیں بلکہ وضاحت کے ساتھ واقعات کا پس منظر بھی بیان کیا ہے۔

''سرور عالم'' مولانا مہر کی باقاعدہ تصنیف نہیں تھی بلکہ انہوں نے دینیات کی کتاب

کے طور پر چھٹی، ساتویں اور آٹھویں درجات کے طالب علموں کے لئے لکھا تھا۔ بعد میں عام فائدے کے پیش نظر اسے کتابی شکل دے دی گئی۔

مولانا مہر کی سوانحی کتاب ''جنرل سر عمر حیات خاں ٹوانہ'' میں پنجاب کے آخری وزیر اعظم خضر حیات خاں ٹوانہ کے والد کی سوانح عمری ہے۔ ویسے تو اس میں جنرل سر عمر حیات خاں ٹوانہ کے حالات زندگی اور ان کا خاندانی پس منظر بالتفصیل ہے۔ یہ کتاب سوانحی ضرور ہے لیکن سوانح نگاری کی وہ خصوصیات نہیں ہیں جو ''سید احمد شہید'' اور ''غالب'' جیسی نایاب کتابوں میں ہیں۔

مولانا مہر نے تالیف وترتیب میں کئی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ جن میں سے چند مع اپنی خصوصیات درج ذیل ہیں۔

''سرود رفتہ'' آٹھ حصوں میں منقسم علامہ اقبال کے کلام کا مجموعہ ہے۔ پہلے حصہ میں ابتداءً شائع ہونے والی نظمیں ہیں۔ دوسرا حصہ باقیات بانگ درا کے عنوان سے موسوم ہے۔ چھٹے حصہ میں قطعات اور متفرقات اشعار ہیں۔ ساتویں حصہ میں قطعات تاریخ اور آٹھویں حصہ میں اقبال کے مزاحیہ کلام کے ساتھ رباعیات اقبال ہیں۔ دراصل سر ود رفتہ کو مولانا مہر کی تحریک پر انہیں کی نگرانی میں صادق دلاوری نے مرتب کیا۔

''نقش آزاد'' میں مولانا ابوالکلام آزاد کے وہ تمام خطوط ہیں جو مرتب یعنی مولانا مہر کے نام لکھے گئے اور ایسے خطوط بھی ہیں جو دوسروں کو لکھے گئے مگر غلطی سے ان تک پہونچ گئے۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں ۱۹۱۴ء سے مولانا آزاد کی وفات تک مولانا مہر کو لکھے گئے خطوط ہیں۔ دوسرا حصہ ''غالب پر مولانا کی تحریرات'' کے نام سے ہے۔ جبکہ تیسرے حصہ میں دوسری شخصیات کو لکھے گئے وہ خطوط ہیں جو ان تک پہنچ گئے۔

''تبرکات آزاد'' میں مولانا آزاد کے مطبوعہ مضامین اکٹھا کئے گئے ہیں۔ اسے دو حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے پہلا حصہ مولانا آزاد کے مکاتیب پر مشتمل ہے اور اس حصہ کو مزید چار حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں مولانا آزاد کے مضامین ہیں۔

دوسرے حصہ میں لکھے گئے ہر مضمون کے آغاز میں مولانا مہر نے ان مضامین کا پس منظر بھی بیان کیا۔

''باقیات ترجمان القرآن'' میں مولانا آزاد کی بکھری ہوئی اور متفرق تحریروں کو بلا کسی ترمیم و اضافے کے ''باقیات ترجمان القرآن'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں مولانا مہر کے حواشی کے ساتھ ۶۰ صفحات کا مقدمہ اور ۱۶ ؍صفحات پر مشتمل ایک دیباچہ بھی ہے۔

''دیوان غالب'' کو مولانا مہر نے تاریخی ترتیب کے بجائے مروجہ اور متعارف ترتیب کے ساتھ شائع کیا ہے۔ یہ دیوان کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ دیوان کے اشعار میں واقع افراد اور رجال کے ناموں کی وضاحت حاشیے میں کی گئی ہے، مشکل الفاظ پر اعراب لگانے کے ساتھ علامات اوقاف کا خاص خیال رکھا گیا ہے، اختلافات متن کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اس میں مرزا غالب کی غزلیات، قصائد، قطعات اور رباعیات ہیں، ساتھ ہی اس میں تین ضمیمے بھی شامل ہیں۔

''تاریخ ارادت خاں'' اختلاف متن کے ساتھ مبارک اللہ واضح المعروف بہ ارادت خاں کی سوانح عمری ہے۔ جس میں انہوں نے اپنی سوانح عمری اس انداز سے پیش کی ہے کہ سلطنت مغلیہ کی اچھی خاصی تاریخ بھی آ گئی ہے۔ اس کتاب کو مولانا مہر نے اصل نسخے کے مطابق از سر نو ترتیب دیا ہے۔ انہوں نے اپنے مقدمہ میں مبارک اللہ واضح کے حالات کے علاوہ تاریخ ارادت خاں کی سرگزشت کے ساتھ اپنے کام کے بارے میں چند وضاحتیں بھی کی ہیں۔

''قطعات، رباعیات، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس'' میں غزل، قصائد اور مثنویوں کو چھوڑ کر غالب کے تمام فارسی کلام کو مولانا مہر نے مرتب کیا ہے۔

''رسول رحمت'' میں اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت پاک کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے والے مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین ہیں۔ رسول رحمت کی ترتیب میں مولانا مہر

نے اپنی طرف سے جن ابواب کا اضافہ کیا ہے، ان کے ساتھ لفظ ''مؤلف'' لکھ دیا ہے۔ اس کتاب میں رسول اللہ کی سیرت طیبہ کے علاوہ جا بجا نقشے اور شجرے بھی ہیں۔

''انبیائے کرام'' میں مختلف انبیاء کی سیرت پر محیط مولانا آزاد کے وہ مضامین ہیں جو ''البلاغ'' اور ''الہلال'' میں شائع ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ترجمان القرآن سے انبیائے کرام کے متعلق کچھ مضامین لئے گئے ہیں۔ مولانا مہر کی یہ کتاب ان کی وفات کے بعد منظر عام پر آئی۔

ان تصانیف کے علاوہ مولانا مہر نے اقبال اور غالب کے کلام کی شرحیں بھی لکھی ہیں۔

''مطالب بال جبریل'' کو شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا۔ ''مطالب ضرب کلیم'' ۱۹۵۸ء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور کے ذریعہ منظر عام پر آئی۔ ''مطالب اسرار و رموز'' اقبال کی ان دونوں فارسی مثنویوں کی شرح کو جولائی ۱۹۶۰ء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے شائع کیا۔ ''مطالب بانگ درا'' کی پانچویں ایڈیشن کو شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے ۱۹۷۶ء میں چھاپا۔

''نوائے سروش'' کلام غالب کی شرح ہے یہ شرح چھ حصوں میں ہے۔ اسے بھی غلام علی اینڈ سنز لاہور نے شائع کیا۔ اس کے علاوہ مولانا مہر نے تقریباً بیالیس کتابوں کے ترجمے بھی پیش کئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے علامہ اقبال کی سوانح حیات، مولانا آزاد کی شخصیت اور کارناموں، شیر میسور سلطان ٹیپو کی سوانح اور کارناموں اور سیاست وصحافت کے حوالے سے تحریک پاکستان اور اس کی تاریخ پر بھی کام کیا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شعر گوئی سے کیا۔ انہوں نے دوسرے بڑے شعراء کی طرح بچپن ہی سے شعر و شاعری شروع کردی تھی۔ مگر جلد ہی شاعری چھوڑ کر نثر نگاری کے میدان میں آگئے۔

مولانا مہر کی پہچان بحیثیت صحافی، مؤرخ، محقق، ناقد، شارح اور مترجم ہے۔

انہوں نے مسلسل ستائیس سال تک صحافتی خدمات انجام دیں اور اداریہ نویسی کر کے ملک و قوم کی خدمت کی ہیں۔ ان کی صحافتی تحریروں میں سرسید کا انداز و اسلوب نظر آتا ہے۔ اگر ان کی سیرت نویسی اور سوانح نگاری دیکھی جائے تو بلا تامل یہی کہا جائے گا کہ انہوں نے اس کام میں بڑی جدو جہد کی ہے۔ دو سوانحی کتابوں (''غالب'' اور'' سید احمد شہید'') نے انہیں زندۂ جاوید کر دیا۔ تاریخ میں ان کے اختیار کئے گئے اسلوب کو محققانہ تاریخ نویسی کہا جاتا ہے۔ سوانح نگاری اور تاریخ نویسی میں شبلی کے بنائے ہوئے اصولوں پر چلنے والوں میں مولانا مہر کا نام سرفہرست ہے۔

تحقیق میں انہوں نے لسانیات کے بجائے واقعات کی تحقیق پر زیادہ توجہ کی ہے۔ انہوں نے غالب اور آزاد کی تحریروں کو جمع کر کے شائع کیا۔ تحقیق میں غالب اور آزاد ان کا خاص موضوع تھے۔ ان شخصیات کے ساتھ مولانا مہر کا بڑا گہرا تعلق بھی تھا۔

ان کی فطرت میں یہ چیز داخل تھی کہ موقع اور محل کی مناسبت سے مرتب کی جانے والی کتابوں اور تصنیفات میں حاشیہ آرائی بکثرت کرتے اور خطوط میں مشکل اشعار کی تشریح بھی کر دیا کرتے تھے۔

دوسرے فنون کی طرح ترجمہ نگاری میں بھی انہیں نمایاں کامیابی حاصل رہی ہے۔ ان کے تراجم کے عناوین اصل کتابوں کے عنوانات کے متن سے مختلف ہوتے ہیں۔ جیسے India Wins Freedom کا ترجمہ'' آزادی ہند کی کہانی'' کے نام سے کیا ہے، یہ بات صرف کتابوں کے عناوین تک محدود ہے۔ مولانا مہر نے نہ صرف کتابوں کا ترجمہ کیا بلکہ حواشی، تعلیقات، حذف و اضافہ کر کے ترجموں کو تصنیف کے درجے پر پہنچا دیا۔ جس طرح علمی و ادبی دنیا میں مولانا مہر کی کئی حیثیتیں ہیں۔ اسی طرح ان کے اسلوب تحریر میں کئی خصوصیات ہیں۔ ان کی تحریروں میں شبلی کی طرح جوش و خروش پائی جاتی ہے۔ ساتھ ہی شبلی کی طرح داعیانہ انداز بھی پایا جاتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں موقع بہ موقع عربی و فارسی ضرب الامثال اور قرآنی آیات بھی پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ انداز بیان مولانا آزاد

سے حاصل کیا ہے۔ ان کی تحریر بڑی حد تک سنجیدہ ہوتی ہے۔ باوجود اس کے کبھی کبھی طنز ومزاح بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

مولانا مہر بے شمار خوبیوں کے مالک رہے ہیں۔ ان خوبیوں کے ساتھ ان کی تبحر علمی کا اعتراف کیا جاتا رہا ہے۔ اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر مکمل عبور رکھنے کے باوجود کبر وغرور سے دور ایک منکسر المزاج انسان نظر آتے ہیں۔ جس کی جھلک ان کی تحریروں میں بھی ملتی ہے۔ ''جس حد تک معلوم ہوسکا'' اور ''معلوم نہ ہوسکا'' کے جیسے جملے ان کی انکساری و عاجزی کی ترجمانی کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سید احمد شہید، غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۴ء، دیباچہ، ص: ۱۵

۲۔ جماعت مجاہدین، غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص: ۶

۳۔ سرگذشت مجاہدین، غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص: ۷

۴۔ تاریخ سندھ، غلام رسول مہر، سندھی ادبی بورڈ، کراچی، ۱۹۵۸ء، ص: ۴

قاضی عبدالودود

(۸رمئی ۱۸۹۶ء-۲۵رجنوری ۱۹۸۴ء)

قاضی عبدالودود کی ولادت ان کی نانہیال کاکو میں مئی ۱۸۹۶ء میں ہوئی جو جہان آباد بہار کی مشہور بستی ہے۔ وہ ایک معزز اور مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کا دادھیالی سلسلہ مشہور صوفی بزرگ امام تاج فقیہ سے ملتا ہے۔ ان کے والد قاضی عبدالوحید مولانا احمد رضا خان بریلوی کے ہم خیال تھے۔ وہ صرف اسی مسلک کے ماننے والوں کو کامیاب و کامران سمجھتے تھے۔ قاضی عبدالوحید کی خواہش تھی کہ قاضی عبدالودود عالم و فاضل کی سند حاصل کریں۔ انہوں نے احمد رضا خانی تحریک کی نشرواشاعت کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس کے علاوہ ایک رسالہ بھی جاری کیا۔ ساتھ ہی وہ مغربیت اور انگریزی تعلیم کے سخت مخالف تھے۔

قاضی عبدالودود کی ابتدائی تعلیم عام رسم و رواج کے مطابق گھر پر ہوئی۔ انہوں نے اردو، فارسی اورابتدائی عربی بھی پڑھی۔ چودہ سال کی عمر میں مکمل قرآن حفظ کرلیا۔
مذہبی تعلیم کی طرف میلان نہ ہونے کے وجہ سے مذہبی تعلیم کو خیر آباد کہہ کر مغربی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ محمڈن اسکول، پٹنہ سے انگریزی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے

بعد علی گڑھ آ گئے۔ علی گڑھ کا یہ وہی اسکول ہے جس کی شدید مخالفت کے سبب اس کے بانی کا نام لینا بھی ان کے والد کو گوارا نہ تھا۔ علی گڑھ آ کر کچھ دنوں تک سلیمان اشرف کے گھر مقیم رہے۔ قاضی صاحب نے ان سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ انہیں جلد ہی کالج کے ایک تاریخی ہوسٹل ماریسن کورٹ میں جگہ مل گئی۔ کچھ دنوں کے بعد میکڈانل ہوسٹل منتقل ہو گئے۔ آج کل یہ دونوں ہوسٹل آفتاب ہال کا حصہ ہیں۔

انہیں انگلستان جانے کی بڑی خواہش تھی۔ چنانچہ انہوں نے بلگرامی ٹیوٹوریل کالج میں داخلہ لیا۔ داخلے کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد جب کالج بند ہو گیا تو مجبوراً سلسلۂ تعلیم منقطع کر کے پٹنہ واپس چلے گئے۔ یہیں انہوں نے انگریزی اور لاطینی زبانیں سیکھیں۔ یورپ میں جنگ عظیم چھڑ جانے کی وجہ سے انگلستان جانے کے تمام راستے بند ہو جانے پر انہوں نے اپنا ارادہ ملتوی کر کے پٹنہ ہی میں تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور ۱۹۱۶ء میں پرائیویٹ ہائی اسکول کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا۔ ۱۹۱۸ء میں انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۲۰ء میں بی۔ اے امتیازی نمبر سے پاس کیا، بی۔اے میں ان کے مضامین انگریزی، اردو، فارسی ادبیات اور تاریخ تھے۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں سیاسی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ انگریزوں کے خلاف تحریکیں جنم لے رہی تھیں۔ تحریک عدمِ تعاون نے بھی اسی زمانہ میں جنم لیا۔ اس تحریک میں حکومت کے تعلیمی ادارے اور ان سے متعلق طالب علم بھی شامل تھے۔ قاضی صاحب نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تحریک میں شامل ہونے کی وجہ سے دو تین برسوں تک ان کا تعلیمی سلسلہ منقطع رہا۔

۱۹۲۳ء میں انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن کا سفر کیا، انگلستان میں قیام کے دوران جب وہ ۱۹۲۷ء میں کیمبرج سے اقتصادیات میں ٹرائی پوس کر رہے تھے تو بیمار ہو کر علاج کی غرض سے سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ یہیں پر ان کی ملاقات جواہر لعل نہرو سے ہوئی اور یہ ملاقات پورے نہرو خاندان سے گہرے تعلقات میں تبدیل ہو گئی۔

انہوں نے اپنی زندگی میں دو شادیاں کیں۔ ان کا پہلا نکاح والدہ کی خواہش کے

مطابق شاہ نظام الدین کی صاحبزادی سے ۱۹۱۴ء میں ہوا۔ رخصتی سے قبل اس خاتون کا انتقال ہوگیا پھر انہوں نے پٹنہ کے معروف وکیل شاہ رشید اللہ کی بیٹی سے ۱۹۲۲ء میں دوسرا نکاح کیا۔ اس خاتون سے ایک اولاد قاضی محمد مسعود پیدا ہوئے۔

انہوں نے بہت سارے ممالک کے سفر کئے۔ وہ خود اپنے سفر کے متعلق لکھتے ہیں کہ

''میں نے دورانِ قیام یورپ میں فرانس، سوئٹزرلینڈ، جرمنی، ہالینڈ اور اٹلی کے کچھ حصے دیکھے۔ ان ممالک میں سب سے زیادہ میں فرانس سے واقف ہوں۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد میں نے یہاں کے بہت سے شہر دیکھے۔ جہاں عموماً میں ریسرچ کے سلسلے میں گیا۔ تقسیم ہند کے بعد میں کراچی، حیدرآباد، سندھ، لاہور اور ڈھاکہ گیا ہوں'' [۱]

قاضی صاحب طالب علمی کے زمانے سے ہی تحریک آزادی میں شامل ہوگئے تھے۔ مولانا حسرت موہانی کے اردوئے معلی کے مطالعے سے انہیں سیاست سے دلچسپی ہوئی۔ اردوئے معلی کا ان پر بہت گہرا اثر ہوا، نتیجتاً متشدد قسم کے کانگریسی ہوگئے۔ اس کے علاوہ الہلال سے بھی کافی متاثر ہوئے۔ یورپ سے واپسی کے بعد کانگریس سے الگ ہوگئے۔ کیونکہ کانگریس میں ان کے تجربے اچھے نہ رہے۔ انہیں اکثریت کے کچھ افراد سے سخت مایوسی ہوئی اور یہ احساس ہوا کہ یہ لوگ اقلیتی فرقے کے ساتھ انصاف نہیں کرسکیں گے۔

کچھ دنوں کے بعد لوگوں کے اصرار پر مسلم لیگ سے جڑ گئے۔ مگر زیادہ دن تک اس جماعت کا ساتھ نہ دے سکے۔ مسلم لیگ سے کیا الگ ہوئے کہ سیاست سے ہمیشہ کے لئے علاحدگی اختیار کرلی۔ یہاں تک کہ اس کے بعد اپنی حق رائے دہی کا استعمال کسی بھی الیکشن میں نہیں کیا۔

ان کو اردو زبان و ادب سے کافی دلچسپی رہی۔ اردو زبان کی ترقی کے لئے چلائی گئی ہر تحریک میں انہوں نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ قاضی عبدالودود انجمن ترقی اردو بہار سے وابستہ اور اس کے اعزازی سکریٹری رہے۔ انہوں نے اردو کو اس کا حق دلانے کے لئے

بڑی جدو جہد کی۔ وہ ایک محقق ہی نہیں بلکہ ناقد اور شاعر بھی ہیں۔ انہوں نے زمانہ طالب علمی میں شاعری کی تھی۔ مگران کا مسلسل کلام دستیاب نہیں ہے۔ وہ شاعری کی پرکھ کرنے والے اور اعلیٰ ذوق رکھنے والے انسان تھے۔

انہوں نے اپنی افسانوی زندگی کا آغاز ۱۹۱۳ء میں ایک کہانی لکھ کر کی۔ طالب علمی کے زمانہ میں یورپ کے افسانوی ادب کا بکثرت مطالعہ کرنے کی وجہ سے ہی اپنی ادبی زندگی کی شروعات کہانی لکھ کر کی۔ لیکن بعد میں شاعری کی طرح افسانہ نویسی سے بھی قطع تعلق کر کے تحقیق وتنقید میں لگ گئے۔

قاضی عبد الودود نے عنفوان شباب میں شاعری، کچھ فارسی اشعار کے ترجمے اور کچھ انگریزی افسانوں کے ترجمے بھی کیے۔ قاضی صاحب نہیں چاہتے تھے کہ انہیں شاعر یا افسانہ نگار کہا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے اشعار اور افسانوں کو کبھی بھی قابل اشاعت نہیں سمجھا۔

قاضی عبد الودود کی ادبی اور تحقیقی زندگی کا آغاز ۱۳-۱۹۱۲ء میں ایک مضمون کے ذریعہ ہوا، یہ مضمون اردو شعرا سے متعلق تھا۔ اس مضمون میں انہوں نے ''گلزار ابراہیم'' کے متعلق چند تحقیقی مباحث پر روشنی ڈالی تھی۔

قاضی صاحب اردو صحافت سے ہمیشہ جڑے رہے۔ ان کو صحافت سے بڑا لگاؤ تھا۔ ان کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۶ء میں ماہنامہ ''معیار'' کے جاری کرنے کے بعد ہوا۔ یہ رسالہ ۱۱۲ رصفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے صرف پانچ شمارے منظر عام پر آسکے۔ جس میں قاضی صاحب کے تقریباً ۴۰ رمضامین شائع ہوئے جن میں کچھ کہانیاں بھی تھیں۔ ''معیار'' بند ہوجانے کے بعد انہوں نے ''معاصر'' کی سرپستی قبول کی۔ انہوں نے ''معاصر'' جاری و ساری رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ ''معاصر'' ایک ایسا تحقیقی اور تنقیدی رسالہ تھا جس کا بنیادی مقصد بہار میں ادبی ذوق پیدا کر کے اسے برقرار رکھنا تھا۔ اس رسالہ میں گم نام شعراء اور ادباء کے متعلق معلومات فراہم کی جاتی تھیں۔

رسالہ ''معاصر'' کے مقاصد کی توضیح ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے۔

(۱) اردو کے معیاری تنقیدی مقالوں کی اشاعت۔

(۲) اردو کے تحقیقی مضامین کی اشاعت۔

(۳) اردو کے غیر مطبوعہ اہم مخطوطات کی اشاعت۔

(۴) اردو کے مختلف علمی اور ادبی مسائل پر بحث و تمحیص۔

(۵) اردو کے ایسے مقالوں کی اشاعت جن کا تعلق سماجی، ثقافتی اور تہذیبی مسائل سے ہے۔

ان مقاصد کے حصول میں ''معاصر'' کو کامیابی ملی۔ اس رسالہ کو جاری رکھنے کے لئے انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے قاضی عبدالودود نمبر شائع کیا گیا۔ قاضی صاحب کے انتقال کے کچھ دنوں بعد یہ رسالہ بھی بند ہوگیا۔

انہوں نے ۱۹۶۳ء میں ''تحقیق'' کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ اس سلسلے کی ان کی یہ آخری کوشش تھی۔ ایک شمارہ نکلنے کے بعد یہ بھی بند ہوگیا۔

فروری ۱۹۶۹ء میں غالب صدی تقریبات کی بدولت دہلی میں دو اہم ادارے وجود میں آئے۔ ایک غالب اکیڈمی دوسرے غالب انسٹی ٹیوٹ جو حکیم عبد الحمید اور صدر جمہوریہ ہند فخر الدین علی احمد کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ قاضی صاحب کو مرزا غالب سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ انہوں نے غالب پر متعدد تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے قیام میں قاضی صاحب کا ناقابل فراموش کردار رہا ہے۔ جس کا اعتراف فخر الدین علی احمد نے خود ان الفاظ میں کیا ہے کہ

> ''اس میں شک نہیں کہ اگر ہمیں قاضی صاحب کے گرانقدر اور مخلصانہ مشورے حاصل نہ ہوتے تو غالب انسٹی ٹیوٹ کو اتنے شاندار پیمانے پر قائم کرنے میں خاصی دشواریوں کا سامنا ہوتا۔'' [۲]

یہ ایک ایسے محقق اور ناقد ہیں جن کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف پوری ادبی اور علمی

دنیا نے کیا ہے۔ ان کو سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی طرف سے متعدد انعامات اور اعزازات نوازے جا چکے ہیں۔

ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دائم المریض رہے۔ ان کے چھوٹے بھائی قاضی محمد سعید کا پھر ان کی اہلیہ کا ۱۹۷۹ء میں انتقال کے حادثے نے ان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

جولائی ۱۹۷۹ء میں اہلیہ کی طرح ان پر بھی فالج کا شدید حملہ ہوا جس سے ان کا داہنا ہاتھ اور بائیں پیر کی انگلیاں متاثر ہوئیں اور صحت ایسی متاثر ہوئی کہ ان کا دل دنیا کی ہر شئی سے اچاٹ ہو گیا۔ بالآخر ۲۵ رجنوری ۱۹۸۴ء کو پٹنہ میں ۸۸ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

وہ ایک شریف، خوش اخلاق اور مہمان نواز انسان تھے۔ ان کے چہرے سے ایک مدبر، دانشور اور عالم کا نقش ابھرتا تھا۔ وہ خوش مزاج، انتہائی مخلص اور محبت سے بھرپور انسان تھے۔ وہ مشرقی تہذیب کا نمونہ ہونے کے باوجود مغربی لباس اور غذا کو بہت پسند کرتے تھے۔

انہوں نے اپنی زندگی میں اردو تحقیق کی بڑی خدمت کی ہے۔ اردو تحقیق کے اصول بنائے ساتھ ہی تحقیق کا معیار بلند سے بلند تر کیا ہے۔ ان کا کل تصنیفی سرمایہ مضامین، مقدمے، مقالات اور تبصروں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے کوئی مستقل تصنیف بطور یادگار نہیں چھوڑی لیکن ان کے بعض بعض مضامین اتنے طویل ہیں جو کئی کتابوں پر بھاری ہیں اور بعض مضامین پوری کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی تخلیقات کی ترتیب و تدوین کی ہیں۔

جوشش عظیم آبادی کے کلام ''دیوان جوشش'' کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے وہ بہت بڑے اور عظیم شاعر نہیں بلکہ ایک معمولی شاعر تھے۔ اس کے باوجود اس دیوان کی ترتیب و تجزیہ پر قاضی عبدالودود نے اتنی محنت کی جس کے جواز کی صرف یہی صورت سمجھ میں آتی ہے کہ وہ اٹھارویں صدی کے شاعر اور میر کے ہم عصر تھے۔

''تذکرۂ شعراء مصنفہ ابن امین اللہ طوفان'' کو انہوں نے تدوین کے تمام مطالبات

کو پورا کرتے ہوئے مرتب کیا جو منظومات کی ترتیب سے کہیں زیادہ مفید اور اہم ہے۔ نہ تو اس تذکرہ کا نام اور نہ ہی اس کے مصنف کا نام معلوم تھا مگر انہوں نے تذکرہ کا جائزہ لے کر اور اپنے تبحر علمی کی بدولت مصنف کی شخصیت کو بڑی حد تک پہچان لیا اور یہ بتایا کہ ابن امین اللہ طوفان کا تذکرہ ''تذکرۂ شعراء'' بہت ہی اہم ہے۔ تذکرہ شعراء ایک تذکرہ ہی نہیں بلکہ دستاویز ہے۔

قاضی عبد الودود کا پسندیدہ موضوع غالب رہا ہے۔ انہوں نے غالب پر بہت سے مضامین اور مقالے قلمبند کیے ہیں اور غالب کی حیات اور کلام سے متعلق ایسے تحقیقی دلائل پیش کیے ہیں جن کا رد کرنا ممکن نہیں۔ انہوں نے غالب پر دو تدوینات بھی پیش کی ہیں۔ ''مآثر غالب'' کو انجمن ترقی اردو بہار نے شائع کیا۔ یہ مدون کتاب غالب کی کمیاب نظم و نثر کا مجموعہ ہے، یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں غالب کی تحریروں کے ہر حصہ سے متعلق بیش قیمت معلومات پیش کی گئی ہیں۔

قاضی عبد الودود کی ''قاطع برہان و رسائل متعلقہ'' غالب پر دوسری تدوین ہے اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ

> ''غالب نے فارسی اردو میں برہان قاطع کے متعلق جو رسالے لکھے تھے میں نے یکجا کر کے ''قاطع برہان و رسائل متعلقہ'' کے نام سے شائع کر دیے ہیں'' [۳]

رضا عظیم آبادی کے سلسلے میں انہوں نے چار مضامین ماہنامہ ''معاصر'' پٹنہ میں لکھے۔ ''دیوان رضا عظیم آبادی'' کی پہلی طباعت ۱۹۵۶ء میں ہوئی۔ اس کی دوسری طباعت ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ سے ۱۹۸۴ء میں ہوئی۔ قاضی عبد الودود تذکروں کے ماہر تھے۔ اس لئے رضا سے متعلق تذکروں میں پیدا کی گئی غلط فہمیوں کا ازالہ کر کے اپنے طور پر رضا کے حالات زندگی لکھے۔ کلام رضا کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ساقط المعیار ہے۔ رضا اس کے مستحق نہیں تھے کہ قاضی عبد الودود جیسے محقق ان کے کلام کی تدوین کریں۔

قاضی صاحب کے چند مضامین کا مجموعہ ''عیار ستان''۔ تین کتابوں کے تبصرے پر مشتمل ہے۔

(۱) دیوان فائز، مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب

(۲) مرقع شعراء، مرتبہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

(۳) میر تقی میر حیات اور شاعری، مولفہ خواجہ احمد فاروقی۔

دلدار بیگ کے کلام کو دیکھنے کے بعد انہوں نے ''قطعات دلدار'' منظر عام پر لانے کا مکمل ارادہ کرلیا۔ یہ ایک مختصر سی کتاب ہے جس میں بہار کے قدیم شاعر دلدار بیگ کے کلام کو قاضی صاحب نے مرتب کر کے پیش کیا ہے۔ قطعات دلدار پرانی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کتاب میں قاضی عبد الودود کے مقدمہ کے بعد متن، حواشی، پس گفتار اور اشاریہ وغیرہ کے عنوان سے کچھ ضروری مباحث ہیں۔

''شہر آشوب قلق'' کو قاضی صاحب نے ایک مختصر مقدمہ کے ساتھ رسالہ ''معاصر'' جولائی ۱۹۶۰ء میں چھاپا۔ بعد میں شہر آشوب قلق کو ادارۂ تحقیقات اردو نے کتابی شکل دی۔

''اشتر و سوزن'' میں دو کتابوں پر تبصرے ہیں۔

''عمدۂ منتخبہ'' یعنی تذکرۂ سرور جسے خواجہ احمد فاروقی نے مرتب کیا ہے۔ ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' کو محمد مسلم عظیم آبادی نے مرتب کیا ہے۔ ان دونوں کتابوں پر انہوں نے عالمانہ بحث کر کے ان میں پائی جانے والی بے احتیاطیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔

انہوں نے ترتیب و تدوین کے علاوہ تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھے۔ جو رسالہ معاصر پٹنہ، نوائے ادب بمبئی، آگرہ اخبار، آجکل دہلی، تحقیق پٹنہ، نقوش لاہور، اشاریہ پٹنہ، تحریک دہلی، معارف اعظم گڑھ، معیار پٹنہ، نیا دور لکھنؤ، فکر و نظر علی گڑھ، صحیفہ لاہور، خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، مطالعہ پٹنہ، شاعر بمبئی، صبح نو پٹنہ، تحریک دہلی، نگار رامپور، ہماری زبان علی گڑھ، اورنگ پٹنہ، المصباح پٹنہ، بہار کی خبریں پٹنہ، ماہ نو کراچی، دلی کالج میگزین، ساغر پٹنہ، صنم پٹنہ، اردو ادب علی گڑھ اور علی گڑھ میگزین میں مختلف اوقات میں شائع ہوئے۔ چند

اہم مضامین جن پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے وہ غالب بحیثیت محقق، آزاد بحیثیت محقق، عبدالحق بحیثیت محقق، آوارہ گرد اشعار، تعین زمانہ، اصول تحقیق، تذکرہ مسرت افزا، تذکرۃ الابرار، تبصرہ فرہنگ آصفیہ، جہان غالب، دریائے لطافت، شاہ کمال علی کمال، دلی کا دبستان شاعری، لکھنؤ کا دبستان شاعری، مرگ انیس، مرگ دبیر، مولانا ابوالکلام آزاد کی قدیم تحریریں اور نعیم دہلوی کے علاوہ سینکڑوں تحقیقی وتنقیدی مضامین، تبصرے اور مقالات ہیں۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری اور ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ نے قاضی عبدالودود کے ان متذکرہ مضامین میں سے بیشتر کو کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔

قاضی عبدالودود کی تحریروں سے تحقیق کی نئی راہیں کھل گئیں۔ ان سے قبل اردو زبان کی تحقیق اور تنقید سطحی، غیر معیاری اور غیر محتاط تھی، مگر انہوں نے ان سب کمیوں اور خامیوں کو دور کر کے ایک نئی جہت کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔

قاضی عبدالودود ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جن کا شمار اردو کے ممتاز عالموں اور عظیم محققوں میں ہوتا ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ صرف اردو تک ہی محدود ہیں بلکہ انہوں نے فارسی زبان و ادب میں بھی تحقیقی خدمات انجام دیں ہیں۔ انہوں نے لسانیات، لغات، قواعد، ادب، نثر، نظم، تذکرہ، تاریخ اور سوانح کے علاوہ دیگر موضوعات کا بھی مطالعہ کیا اور جو کچھ بھی ان پر لکھا وہ اپنی اہمیت اور قدر و قیمت میں لاجواب ہے۔

انہوں نے اردو اور فارسی زبان میں سنجیدہ تحقیق اور عالمانہ تنقید کی ایسی روایت قائم کی ہے، جس سے علمی ذخیرے میں اضافے ہی ہو رہے ہیں۔ تحقیق اور تنقید کے لئے ان کے بنائے ہوئے اصول وضوابط مشعلِ راہ کا کام کر رہے ہیں۔

آرنلڈ نے تحقیق کے بارے میں کہا تھا Let us keep our standards high قاضی صاحب کا تحقیق کے بارے میں یہی خیال ہے کہ معیار بلند رکھو اور وہ معیار بلند رکھتے ہیں۔ ان کا معیار بلند رکھنے کے اس اصول سے گریز کرتے ہوئے چند محققین نے ان کی تحقیق کو تخریبی تحقیق کا نام دیا ہے۔ جب کہ انہوں نے تحقیق کا اصل مقصد یعنی نئی

معلومات کو پیش کیا ہے۔ تخریبی تحقیق اس لئے کہتے ہیں کہ انہوں نے دوسروں کے تسامحات کی نشان دہی کی ہے۔ مگر لوگ یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ یہ نشان دہی بغیر وسیع اور گہری تحقیق کے ناممکن ہے اور ان کی تحقیق میں یہی وسعت اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ ان کی سخت گیری کا شکوہ عام ہے لیکن یہی سخت گیری اردو تحقیق کے لئے کسی نعمت سے کم نہیں۔ قاضی صاحب کا معیار تو اس قدر بلند ہے کہ انہیں خود اپنے کاموں سے تشفی نہیں ہوتی۔ انہوں نے تو تحقیق کا ایسا معیار قائم کر دیا ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی ہے۔

ہر ذی شعور ادیب یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ اردو تحقیق کو ان جیسا کسی اور نے متاثر نہیں کیا۔ انہوں نے تسامحات کی گرفت کر کے احتیاط برتنے کا درس دیا ہے۔ ان کی تحریریں اس بات کا عملی ثبوت ہیں کہ انہوں نے تحقیق کے بہت سے بتوں کو توڑا ہے۔ اسی لئے بت شکن محقق کہے جاتے ہیں۔ انہوں نے تحقیق کی بہت سی قدیم روایات کو کالعدم قرار دے کر نئی روایات کی تعمیر کی ہے۔ قاضی عبدالودود کی تحقیق سے متعلق رشید حسن خان ایک جگہ لکھتے ہیں

> ''قاضی صاحب کی تحریروں سے تحقیق کو جو طاقت ور عناصر ملے ہیں ان میں ظاہری سطح پر سب سے نمایاں چیز تحقیق کی زبان اور وہ اسلوب جو معنویت سے معمور اور رنگینی سے محفوظ ہے''

قاضی عبدالودود مربوط انداز سے تحقیق سے حاصل کردہ معلومات کو نہایت سادگی اور اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ وہ کبھی بھی شخصیات کو سامنے نہیں رکھتے بلکہ تحریریں اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ متون کی کمزوریوں پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کا تعلق براہ راست متون (Texts) سے ہوتا ہے کمزوریوں یا تسامحات کی گرفت کے بعد اس کی تصحیح کی پوری کوشش کرتے ہیں۔

ان کے اسلوب نگارش میں وضاحت اور صراحت ہوتی ہے۔ ان کے کلام میں منطقی ربط اور سادگی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی نثر کو پرتاثیر بنانے کے لئے سادگی، وضاحت، صفائی

اور صراحت کو اختیار کرتے ہیں۔ ان کی نثر مدلل ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک نثر کا حسن شفاف پن میں ہے۔ قاضی صاحب نثر میں شاعرانہ آراستگی کے دخل کو ناپسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مولانا محمد حسین آزاد کے نثری اسلوب کے قائل ہیں اور اسی کو اختیار کرتے ہیں۔ قاضی صاحب مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب کو اختیار نہیں کرتے کیونکہ ان کی نثر میں شاعرانہ تخیلات اور شاعرانہ آراستگیاں ہوتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ معاصر (قاضی عبدالودود نمبر) پٹنہ، اگست، ۱۹۷۶ء، ص: ۲۲

۲۔ غالب نامہ (قاضی عبدالودود نمبر) دہلی، ۱۹۸۷ء، ص: ۱۲

۳۔ معاصر (قاضی عبدالودود نمبر) ص: ۲۰

وجاہت حسین عندلیب شادانی

(۱۸۹۷ء - ۲۹ر جولائی ۱۹۶۹ء)

وجاہت حسین عندلیب شادانی ۱۸۹۷ء میں ضلع مرادآباد کی ایک بستی میں پیدا ہوئے اور ۲۹ جولائی ۱۹۶۹ء کو ڈھاکہ میں وفات پائی۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی ادبی دنیا میں مختلف حیثیتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ شاعری، افسانہ نگاری، تحقیق نگاری اور تنقید نگاری کے علاوہ تاریخ نویسی میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ انہیں جو شہرت اور مقبولیت تحقیق اور تنقید کے میدان میں ملی وہ شاعری اور افسانہ نگاری سے نہ مل سکی۔ انہوں نے اردو شعر و ادب کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، وہ ایک بہترین نثر نگار اور بہترین شاعر ہیں، ان کے اچھے نثر نگار اور اچھے شاعر ہونے میں کسی انصاف پسند آدمی کو شبہہ نہیں ہوسکتا۔ ان کی شاعری بڑی حد تک عنفوان شباب کی شاعری ہے۔ شادانی کے جذبات ستر سال کی عمر میں بھی اتنے ہی شاداب نظر آتے ہیں جتنے وہ سترہ سال کی عمر میں ہوسکتے تھے۔ شادانی روایت پسند نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے رسمی شاعری کو اختیار نہیں کیا اور اپنی غزلوں میں موضوعات کو حسن و عشق سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ اردو غزل کو ایک محدود دائرے میں مقید کردینے کی وجہ سے ان پر

شدید نکتہ چینیاں کی گئیں۔ کیونکہ انکا زمانہ جدید اردو شاعری کا زمانہ تھا۔ مولانا حالیؔ کی کتاب ''مقدمہ شعروشاعری'' کی اشاعت کے بعد غزل میں وسعت پیدا ہورہی تھی اور علامہ اقبال کی فکراور فلسفے نے غزل کو ایک نیا موڑ دیا تھا۔ اگر شادانی کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان پر لگائے گئے اس الزام کو زیادتی سے تعبیر کیا جائے گا کیونکہ ان کا کلام خلوص اور سچائی سے لبریز ہے۔ ان کی غزلیں ان کے تاثرات قلبی اور دلی جذبات کی ترجمان ہیں۔

انہوں نے کسی شاعر کی پیروی نہیں کی اتنا ضرور کیا کہ ان کے کلام میں دہلی کے اساتذہ کا رنگ نظرآتا ہے۔ انہوں نے غزل اور تغزل کے لوازمات کو برتا ہے۔ زندگی کے تجربات اور واردات عشق کے دائرے سے باہر کبھی قدم نہیں رکھا، ان کا ایک ایک شعر افسانہ ہے۔ کلاسیکی ادب اور شاعری کا مطالعہ انہوں نے بدرجۂ اتم کیا تھا۔ اس کے باوجود ان کی شاعری قدماء کی شاعری سے الگ لگتی ہے۔ حسن وعشق کے مختلف معاملات، مسائل اورمختلف واردات ان کے موضوع اور عشق کا مرکز ہیں ہمیں ان کی شاعری میں ستھراپن اور سنبھلا ہوا انداز ملتا ہے۔ جسے وہ بڑی نفاست کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں غزلیں بہت اہم ہیں۔ انہوں نے ''نشاط رفتہ'' میں بائیس غزلوں کے ساتھ سولہ نظمیں لکھی ہیں اوراس کے بعد بھی چند نظمیں لکھی ہیں، مسلسل غزلوں کے علاوہ انہوں نے زیادہ تر مفرد اشعار پر طبع آزمائی کی ہے۔ شادانی کی شاعری میں ان کا محبوب ایک انفرادی حیثیت کا مالک ہے۔ ان کا محبوب مہر ووفا کا مجسم ہے کیونکہ وہ جفائے محبوب کی رسمیات کا پابندنہیں اور نہ ہی عاشق پرظلم وستم کرتا ہے بلکہ وہ ایک دردمندانہ دل رکھتا ہے۔

نشاطِ رفتہ میں الفاظ کی سادگی اور روانی نے کلام اور زبان کو برجستہ اور برمحل بنا دیاہے۔ شادانی صاف، شائستہ اور رواں زبان استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں کنایہ، تشبیہ، استعارہ اور تمہید وغیرہ کا برمحل استعمال کیا ہے، نشاط رفتہ میں مسلسل غزلوں کے علاوہ طویل نظمیں اورآزادنظمیں بھی ہیں، ان خوبیوں کے ساتھ ان کی

شاعری میں کچھ خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر شادانی ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے ہیں، انہیں فن افسانہ نگاری کے اصولوں سے واقفیت نہیں تھی مگر جب انہوں نے افسانہ نگاری کی ایک صنف ''سچی کہانی'' لکھی اور ''سچی کہانیاں'' کی مقبولیت نے انہیں اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے فن افسانہ نگاری کے اصولوں کو جاننے کے لئے مغربی ادب کا خصوصی طور پر مطالعہ شروع کیا۔ انہوں نے فن افسانہ نگاری کے چند اہم اصول پیش کر کے اس میں مزید اضافہ کیا ہے۔ انہوں نے ''سچی کہانیاں''، ''نوش و نیش'' اور ''چھوٹا خدا'' لکھ کر افسانہ نگاروں کی فہرست میں اپنا نام درج کرالیا۔

ایک زمانہ تک ان کے اشعار اور سچی کہانیاں عندلیب شادانی کے بجائے پریم پجاری کے نام سے شائع ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی افسانہ نگاری کے سلسلے میں نظیر صدیقی رقم طراز ہیں۔

> ''وہ اپنے افسانوں کو سچی کہانیاں اس لئے کہتے ہیں کہ ان کے دعوے کے مطابق ان کے افسانوں کے واقعات بالکل سچے ہیں گویا وہ اپنی کہانی کا پلاٹ خود نہیں بناتے بلکہ دوسروں کے دیئے ہوئے اور سنائے ہوئے واقعات کو جو ذاتی سرگذشت کی حیثیت رکھتے ہیں، اپنے لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں۔ ممکن ہے شادانی صاحب اپنی سچی کہانیوں میں اس سے زیادہ کچھ نہ کرتے ہوں مگر انصاف اور ایمان کی بات یہ ہے کہ ان کی سچی کہانیوں میں مختصر افسانے کی بہت سی بنیادی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔'' [۱]

انہیں اصل شہرت اس وقت ملی۔ جب ان کے تنقیدی مضامین ''دور حاضر اور اردو غزل گوئی'' کے نام سے ماہنامہ ساقی (دہلی) میں قسط وار شائع ہوئے۔ ان مضامین نے پوری علمی و ادبی دنیا میں تہلکہ مچا دیا اور ان مضامین کی بدولت شادانی متعارف اور مقبول عام ہوئے۔

ان مضامین کے علاوہ بھی ڈاکٹر شادانی کے دیگر تنقیدی مضامین وقتاً فوقتاً ملک کے

معیاری اور مشہور جریدوں میں شائع ہوتے رہے، ان کے اکثر مضامین تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیقی مواد اور معلومات سے بھر پور ہوتے تھے۔

شادانی نے اپنے تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھنے کا سلسلہ ماہنامہ ساقی (دہلی) سے شروع کیا۔ یہ مضامین جب ''دور حاضر اور اردو غزل گوئی'' کے نام سے قسط وار شائع ہونا شروع ہوئے تو اردو تنقید کی دنیا میں ہنگامہ برپا ہوگا۔ کیونکہ شادانی نے ان مضامین میں دور حاضر کی غزل کی مکمل عکاسی کی تھی۔ ممتاز اور بڑے غزل گو شعراء پر اعتراضات کئے تھے، بہت سے ممتاز اور بڑے غزل گو شعراء کے کلام کو روایتی اور فرسودہ کہا، ان شعراء کی شاعری میں صداقت کے فقدان کا حکم بھی صادر کیا۔ ان کے کلام میں بہت سی غلطیاں نکالیں۔ جبکہ اس زمانے میں ان شعراء کی عظمت کا ہر کوئی قائل تھا۔ ان مضامین کی بدولت اردو ادب کی تنقیدی دنیا میں شادانی کا نام ابھر آیا۔ ڈاکٹر شادانی کے یہ تمام مضامین ''دور حاضر اور اردو غزل گوئی'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوکر منظر عام پر آئے جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی اس وقت اسے مقبولیت تو حاصل نہ ہوسکی مگر کئی اساتذہ نے اسے تحسین بھری نظروں سے دیکھا اور ان کے اس اقدام کی تعریفیں کیں۔ اس کتاب میں شادانی نے نئے اور پرانے ادب کا تجزیہ کرکے اردو غزل گو شعراء کی خامیوں اور کمیوں کو نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے اس وقت ان کے خیالات اور نظریات سے بہت ہی کم لوگوں نے موافقت کی تھی، اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد شادانی کو خود تنقید کا نشانہ بننا پڑا ساتھ ہی ان کے تنقیدی استدلال کا ہر کسی نے لوہا بھی مانا ہے۔

دور حاضر اور اردو غزل گوئی میں انہوں نے فراق کے مقالہ ''اردو غزل گوئی'' کا بھر پور جواب دیا ہے۔ فراق کے نزدیک عصر حاضر کے شعراء نے اپنے بزرگوں کی روایتی شاعری سے اجتناب کیا ہے اور نئی امنگ اور نئے آہنگ کے ساتھ خلوص و صداقت کے ساتھ اپنے جذبات کی ترجمانی کی ہے مگر شادانی نے فراق کے اس بیان کو ماننے سے انکار کردیا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ عہد حاضر کے یہ نامور شعراء اب تک روایت پرستی کے شکار

ہیں دور حاضر کے شعراء اب بھی پرانی روش پر گامزن ہیں ان کے کلام میں اصلیت، جوش اور سچائی کا فقدان ہے، عندلیب شادانی نے ایک باغی کی طرح کھلم کھلا روایتی شاعری اور چوٹی کے نامور شعراء کے خلاف علم بغاوت بلند کردی۔ انہوں نے حالی کے کلام کی بہت سی خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے غالب، جوش، شیفتہ، انیس، دبیر، نیاز فتحپوری اور فرمان فتحپوری کی بھی علمی وادبی فروگذاشتوں کی نشاندہی کی ہے۔ شادانی اس تنقید سے کسی کی تحقیر نہیں کرتے ہیں۔ شادانی نے اپنی اس کتاب میں امام المتغزلین حسرت موہانی تک کو نہیں بخشا۔

اس کتاب میں انہوں نے مستند دلائل کے ذریعہ ممتاز شعراء حسرتؔ، جگرؔ، اصغرؔ اور فانیؔ کے کلام پر بھی اعتراضات کئے اور یہ کہا ہے کہ ان سب کے کلام میں لغویات ہیں، ان شواہد کی روشنی میں شادانی کے بیان کی صحت پر شبہہ نہیں کیا جاسکتا۔

انہوں نے تنقید کرتے وقت بڑی شدت اور سختی سے کام لیا ہے۔ ان کے بیان میں طنز اور ترشی ہے جو اصول تنقید کے منافی ہے، اس کے علاوہ انہوں نے تمسخرانہ اور استہزائیہ انداز بیان بھی اختیار کیا ہے۔ جو ان کی تنقید کے لئے زہر قاتل ثابت ہوا، انہوں نے جن شعراء کے کلام کو لغویات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اس وقت ان شعراء کے کمال وفن کا ہر کوئی مداح تھا۔ اس لئے شادانی کے دلائل اصلیت اور سچائی پر مبنی ہونے کے باوجود قبول عام نہ ہوسکے۔ کچھ لوگوں نے ان کی تنقید کو تعمیری ادب کے بجائے تخریبی ادب کہا ہے اور انہیں تنقید نگار کے بجائے تنقیص نگار کہا ہے اگر شادانی اپنی تنقید میں نرمی برتتے تو آج اردو تنقید کی تاریخ میں چند نامور نقادوں کے ساتھ ان کا نام بھی سرفہرست ہوتا۔

ڈاکٹر شادانی کی تنقید صاف، سیدھی اور سلجھی ہوئی تھی، تنقید نگاری میں انہوں نے الفاظ کی رنگینی، عبارت آرائی، مرقع ومقفیٰ جملے اور تصنع وتکلف کے اہتمام سے حتی الامکان احتراز کرتے ہوئے اپنے خیالات کو روزمرہ کی عام فہم زبان میں پیش کیا ہے۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں جو سبق سکھلایا ہے کہ تخیل کی بے راہ روی اور بے اعتدالی تنقید

کے لئے مضر ہے۔ اس پر عمل کرتے ہوئے شادانی نے اپنی تنقید کی زبان کو سادہ بنائے رکھا۔

ان کی بعض تنقید میں تحقیق نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے ان کی تنقید بڑی غور وفکر کا نتیجہ ہوتی ہے کسی بات کی تحقیق میں عجلت سے کام نہیں لیتے۔ سنی سنائی باتوں پر کبھی اعتقاد نہیں کرتے بلکہ بذات خود چھان بین کرتے ہیں۔

شادانی کی زبان کی درشتگی اور ان کے زہر آلود الفاظ کے باوجود ان کی تنقید کے محققانہ پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے، ان کی تاریخی معلومات نے ان کی تنقید کو جامع بنادیا ہے ان کے تحقیقی مقالہ ''ہندوستان کے مسلم مؤرخ'' میں تحقیق و تنقید کا سنگم نظر آتا ہے، تاریخ کے گمنام گوشوں پر ان کی بصیرت نئے راستے کھوج نکالتی ہے، ان کے بعض مقالوں میں تنقید اور تاریخ کا گہرا امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کی تنقید میں تاریخی واقعات کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ تاریخی تنقید میں نقاد فنکار کے خاندان، ماحول اور اس کی تخلیق کا مطالعہ تاریخی روشنی میں کرتا ہے۔ اس مقالہ کے شروع میں شادانی نے ان تمام تاریخی باتوں کو غلط بتایا ہے۔ جن کا ذکر عصامی نے اپنی مثنوی فتوح السلاطین میں کیا تھا۔ تنقید کرتے وقت شادانی جزئیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ الفاظ، محاورات، صرف ونحو کے اصول کے بڑے پابند تھے۔ صحت زبان کا وہ حد درجہ خیال رکھتے تھے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود ان کی تنقید نگاری میں کچھ خامیاں بھی موجود ہیں جس کی بنیاد پر بحیثیت نقاد انہیں وہ درجہ نہ ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ دوسروں پر تو وہ تنقید کی بوچھار کرتے ہیں مگر اپنے مضامین میں بھی کبھی کبھی ایسی ہی غلطیوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ان کی تنقید اور تحقیق میں ایک بات یہ بھی کھٹکتی ہے کہ وہ ایک ہی بات کو بار بار دہراتے ہیں اگر ان کے چند مقالے اکٹھے کر کے دیکھے جائیں تو ان میں سے چند مقالوں کا موضوع بھی یکساں ملے گا۔

ڈاکٹر شادانی کی تنقید نگاری کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ انہوں نے تنقید کے ساتھ تحقیق کا حق بھی ادا کردیا ہے انہوں نے تحقیق کے میدان میں کئی

اہم انکشافات کئے۔ جنہیں آج بھی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے تنقید سے زیادہ تحقیقی میدان میں کارنامے انجام دیئے۔ بحیثیت محقق ان کا درجہ نقاد سے بلند ہے۔ ان کی کتابیں ''تحقیقات'' اور ''تحقیق کی روشنی میں'' اردو ادب کا ایک گراں قدر سرمایہ سمجھی جاتی ہیں، یہ دونوں کتابیں مختلف موضوعات پر مبنی تحقیقی مقالوں کا مجموعہ ہیں ان کتابوں میں تحقیق کا پلہ تنقید سے بھاری نظر آتا ہے۔ یہ مقالات کتابی شکل میں شائع ہونے سے قبل مختلف رسالوں میں چھپ چکے تھے ان کتابوں کے علاوہ ان کا تحقیقی مقالہ '' ہندوستان کے مسلم مؤرخ'' بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اس مقالہ پر انہیں لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔

''تحقیقات'' ڈاکٹر شادانی کے تحقیقی مقالوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں سترہ تحقیقی و تنقیدی مقالات ہیں، اس کتاب کے اکثر مقالے ادبی نقطۂ نظر سے خالص تحقیقی ہیں۔ ہاں کچھ مقالے ایسے ہیں جن میں تحقیق اور تنقید کی آمیزش ہے، اس کتاب کا سب سے پہلا مضمون ''کسوٹی'' بڑی حد تک نظریاتی تنقید کی مثال پیش کرتا ہے، اس مضمون میں انہوں نے اردو شاعری کے ارتقاء پر بحث کرتے ہوئے تنقید کے اصول کو بیان کیا ہے کتاب کے دوسرے مقالہ '' آزاد نظم'' میں انہوں نے آزاد نظم کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے یہ بتایا کہ آزاد نظم کہاں پیدا ہوئی اور کن مراحل سے گزر کر ہندوستان پہنچی انہوں نے آزاد نظم لکھنے کا طریقہ بیان کرنے کے بعد اس کی خامیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ نیز اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ عام طور پر معمولی ذہن کے اشخاص کی سمجھ سے آزاد نظم بالاتر ہوتی ہے۔ ''مختصر افسانہ'' میں فن افسانہ نگاری کے اصولوں سے بحث کی گئی ہے، اس کتاب کے ایک دوسرے مقالے ''پرائیویٹ خطوط'' میں انہوں نے ذاتی اور نجی خطوط کی اہمیت اور قدر و قیمت کا جائزہ لیا ہے۔ ''ایک خاص رنگ'' شادانی کا تنقیدی مضمون ہے جو میر کی امرد پرستی کی مثال ہے اس مضمون میں تنقید کے ساتھ تحقیق بھی ہے۔ جوش کی دولسانی غلطیوں میں لفظ ''خضر'' کے حروف کے حرکات اور لفظ '' کافر'' میں فا کے فتحہ پر بحث کی گئی ہے۔

''ایران کی امرد پرستی کا اثر اردو شاعری پر'' میں انہوں نے بڑی جدو جہد کے بعد ایران کے ان تمام شعراء کے کلام کو پیش کیا ہے جو امرد پرستی پر مبنی ہیں۔ ''خواجہ حافظ اور شراب و شاہد'' میں انہوں نے اپنے گہرے ادبی مطالعہ سے خواجہ حافظ کے عشقیہ اور رندانہ اشعار کی مثالیں پیش کی ہیں، ''یزداں شکار'' جو کہ شادانی کا تحقیقی مقالہ ہے اس میں انہوں نے نیاز فتحپوری کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے جو انہوں نے جوش کی اصطلاح یزداں شکار پر کی تھی۔ شادانی نے صرف ونحو، لغت اور قواعد کے قاعدوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مستند اہل زبان کے حوالے سے جوش کی اصطلاح کو صحیح قرار دیا ہے اس کتاب کے آخری مقالہ ''ایک تابناک ستارہ'' میں انہوں نے ایک نوجوان شاعر اختر انصاری کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس مقالہ میں انہوں نے تنقید نگاری کے اصول غیر جانبداری سے انحراف کیا ہے اور اپنی ذاتی پسند کو اچھا خاصا بڑھا کر پیش کیا ہے۔

''تحقیق کی روشنی میں'' ڈاکٹر عندلیب شادانی کے تحقیقی اور تنقیدی مقالوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب اکیس تحقیقی وتنقیدی مضامین پر مشتمل ہے، اس کتاب کی تدوین و اشاعت میں پروفیسر نظیر صدیقی کا اہم رول رہا ہے انہیں کی کوششوں کی بدولت یہ کتاب منظر عام پر آئی، اس سلسلے میں پروفیسر نظیر صدیقی خود کہتے ہیں کہ

> ''تحقیق کی روشنی میں'' ڈاکٹر عندلیب شادانی کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو گزشتہ پندرہ سال کے اندر لکھے گئے اور جو میرے برسوں کے اصرار کے بعد پہلی مرتبہ کتابی شکل میں پیش کئے جارہے ہیں۔'' ۲

یہ ایک ایسی کتاب ہے جس پر انہیں داؤد ایوارڈ ملا اس کتاب کے اکثر مقالے تحقیقی، تنقیدی اور ادبی نقطۂ نظر سے کافی اہم ہیں۔ مگر کچھ مقالے ایسے بھی ہیں جن میں ادب کی چاشنی معدوم ہے ساتھ ہی تحقیقی مواد کا فقدان بھی نظر آتا ہے اور کچھ مقالے ایک دوسرے کے صدائے بازگشت ہیں ''سرقہ اور توارد'' فروری ۱۹۴۷ء کے جریدہ ''ادب لطیف'' لاہور میں چھپا اور ''ایک دلچسپ توارد'' ۱۹۴۷ء میں پٹنہ کے رسالہ ''معیار'' میں شائع ہوا۔ ان

دونوں مضامین کی کڑیاں آپس میں ایک دوسرے سے اس قدر ملی ہوئی ہیں کہ انہیں ایک ہی مضمون کے زمرے میں لایا جا سکتا ہے۔ ''ایک دلچسپ توارد'' میں انہوں نے بڑے دلچسپ انداز میں غالب کے ان اشعار کو بھی توارد بتایا ہے جسے غالب نے اپنی شاعری میں توارد کی بدگمانیوں کو دور کرنے کے لئے ظریفانہ انداز میں لکھے تھے۔

اس کتاب کے چند مضامین مختلف مقالوں کے جواب میں ہیں جو اہل قلم اور ارباب فن سے متعلق ہیں۔ یہ مضامین تحقیق کا کوئی اعلیٰ معیار پیش نہیں کرتے ہیں ان سے کچھ نئی باتوں کا علم ضرور ہوتا ہے۔ '' کچھ قافیے کی بات'' ڈاکٹر سید عبداللہ کے مقالے کا جواب ہے، ''چند تصریحات'' قمر نعمانی کے سوال کا جواب ہے، ''گنبد یا گنبد'' میں با کی تحقیق کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نیاز فتحپوری کی تحقیق غلط ہے جو انہوں نے ''گنبد'' کو ''گنبد'' یعنیبالضم صحیح قرار دیا ہے۔ ''قواعد اور قیاس'' میں ''یزداں شکار'' کی باتوں کو دہرایا گیا ہے۔ ''ادب میں عریانی، فحاشی'' کوئی خاص تحقیقی و تنقیدی معیار پیش نہیں کرتا۔ کچھ مقالے معرکۃ الآراء اور بہت ہی اہم ہیں۔ کتاب کا پہلا مضمون ''شیفتہ ایک نقاد کی حیثیت سے'' سب سے اہم مقالہ ہے، یہ تحقیقی اور تنقیدی دونوں لحاظ سے شاہکار کہلانے کا مستحق ہے، اس مقالے میں شادانی نے مختلف حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ غالبؔ اور حالیؔ کے اقوال سے قبل شیفتہ کی سخن گوئی کا ہر کوئی مداح تھا، شیفتہ کے سخن فہمی کی سب سے پہلے تعریف الطاف حسین حالیؔ نے یادگار غالب میں کی ہے۔

شادانی نے بڑی تحقیق و کاوش اور جدوجہد کے بعد مختلف کتابوں کے حوالوں کو یکجا کر کے اس مقالے میں تحقیق کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔ اس کتاب کا دوسرا اہم تحقیقی مقالہ ''ریختی کا موجد'' ہے اکثر اساتذہ انشاء اللہ خاں انشاء کو ریختی کا موجد قرار دیتے ہیں۔ جبکہ انشاء اللہ خاں انشاء نے اپنی کتاب ''دریائے لطافت'' میں خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ریختی کے موجد رنگین تھے۔ ڈاکٹر شادانی نے اس حقیقت کو پیش کرنے کے بعد ریختی اور ریختہ کے فرق کی وضاحت کی ہے۔ ''مرزا غالب اور دوسرے غالب'' ایک دلچسپ مضمون

ہے اس میں شادانی نے مرزا غالب کے ہم نام دس اشخاص کی نشاندہی کی ہے جو غالب کے معاصرین تھے۔ اس مقالے میں شادانی نے کئی غالب کا حوالہ دیا ہے جو مرزا غالب سے پہلے گذر چکے تھے اور ان کے معاصرین میں بھی کم سے کم آدھا درجن شعراء اپنا تخلص غالب رکھتے تھے۔ دس غالبوں کو ڈھونڈ نکالنا اور ان کے حالات زندگی پر روشنی ڈالنا شادانی کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ''خان اور ان کا دیوان'' اسی طرح کا ایک مضمون ہے انہیں اشرف خاں دہلوی خاںؔ کے دیوان اول کا نسخہ ڈھاکا کے ایک کباڑی سے حاصل ہوا، اس دیوان کی دریافت کے بعد انہوں نے یہ مضمون لکھا اور خاں کی زندگی کے حالات اور طرز کلام کا ایک جائزہ پیش کیا ہے۔ ''گلشن نو بہار''، ''مخزن فوائد'' اور ''دیوان جہاں'' پر ان کے لکھے ہوئے مقالے تحقیقی دنیا میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

اس مجموعہ کا ایک بڑا اور اہم تحقیقی مقالہ ''حالی اور پیروی مغربی'' ہے اس مقالہ میں حالی کے اس شعر پر عالمانہ بحث کی گئی ہے۔

حالیؔ اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

اس شعر کے متعلق بعض نامور اساتذہ کہتے ہیں کہ حالی ایرانی شاعر مغربیؔ کی پیروی کرنا چاہتے تھے مگر اس مقالے میں شادانی نے یہ ثابت کیا ہے کہ حالی ایرانی شاعر مغربی نہیں بلکہ مغربی ادب اور شاعری کی پیروی کو اپنا مسلک بنانا چاہتے تھے۔ شادانی نے مغربی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ واضح کیا کہ مغربی ایران کا کوئی بلند پایہ شاعر نہ تھا بلکہ ایک اوسط درجہ کا شاعر تھا۔

اس مجموعہ کے ایک دوسرے مقالہ ''لکھنوی شاعری کی خصوصیات'' میں انہوں نے دبستان لکھنؤ کی چند اہم خصوصیات کو مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے، شادانی نے بڑی باریک بینی سے ان اہم خصوصیات کو بیان کیا ہے جو محققین کی نگاہوں سے مخفی تھے انہوں نے ہر خصوصیت پر ایک عنوان کے تحت روشنی ڈالی ہے، اس مقالے میں لکھنؤ کی بارہ خصوصیات

یہاں آورد کا نام و نشان نہیں ، ان کی شاعری میں زبان و بیان کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

عمر کے آخری دنوں میں مصروفیات کے بڑھ جانے سے علمی و ادبی کاموں میں ان کی دلچسپی کم ہوگئی تھی۔ ورنہ وہ اردو ادب کی دنیا میں مزید کارنامے انجام دیتے۔

حوالہ جات

۱ ڈاکٹر عندلیب شادانی ایک مطالعہ، نظیر صدیقی، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص: ۱۶۰
۲ ڈاکٹر عندلیب شادانی ایک مطالعہ، ص: ۱۵۰

سید محی الدین قادری زورؔ

(۲۵ر دسمبر ۱۹۰۵ء - ۲۴ر ستمبر ۱۹۶۲ء)

محی الدین قادری زورؔ کی پیدائش حیدرآباد کے محلہ شاہ گنج میں ۲۵ر دسمبر ۱۹۰۵ء (۲۸ر رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ) کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد مدرسہ دار العلوم میں داخلہ کرا دیا گیا۔ مدرسہ سے نکل کر سٹی ہائی اسکول میں داخلہ لیا پھر عثمانیہ کالج میں داخل ہوئے۔ بہر کیف ۱۹۲۷ء میں انہوں نے اردو میں اول نمبر سے ایم اے پاس کیا، جس کی بنا پر حیدرآباد کی حکومت نے انہیں مزید تعلیم کے لئے انگلینڈ بھیج دیا۔ لندن میں انہوں نے ''اردو زبان کا آغاز اور ارتقاء'' کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ دو سال کے اندر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کر کے لسانیاتی تحقیق کے سلسلے میں لندن یونیورسٹی ہی سے ابتدائی سنسکرت اور لسانیات کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں مزید تعلیم کے لئے پیرس گئے۔ وہاں یونیورسٹی کالج میں داخلہ لے کر عام فنِ صوتیات اور انگریزی صوتیات کا علم حاصل کر کے ۱۹۳۱ء میں حیدرآباد واپس آ گئے۔ جامعہ عثمانیہ میں اردو کے استاد کی حیثیت سے ان کی تقرری ہوئی۔ ۱۹۵۰ء میں چادر گھاٹ کالج کے پرنسپل مقرر ہو کر یہیں سے ۱۹۶۰ء میں ریٹائر ہوئے۔ یہاں کی ملازمت سے سبکدوش ہوتے ہی کشمیر یونیورسٹی نے شعبۂ اردو میں

پروفیسر کی جگہ پر بلالیا اور کشمیر ہی میں ۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ء کو دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے انتقال ہوا۔ زورؔ کو سری نگر کے خانیار شریف کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

زورؔ ایسی شخصیت کا نام ہے جس نے تقریباً ۴۰ سال تک اردو زبان اور ادب کی خدمت کی۔ انہوں نے زیادہ تر دکنی ادب پر کام کیا ہے۔ دکن میں پیدا ہونے کی وجہ سے ان کے لئے دکن کا ہر ذرہ دیوتا ہو گیا۔ انہوں نے قدیم دکنی ادب کے شہ پاروں کی بازیافت کی اور بہت سے اہم مخطوطات کو مرتب کر کے شائع کیا۔

انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سے اہم کام کئے ہیں۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ زور کا سب سے اہم کارنامہ ''ادارۂ ادبیات اردو'' کا قیام ہے جسے ۱۵ جنوری ۱۹۳۱ء کو قائم کیا گیا۔ اسی ادارے سے ''سب رس'' نام کا ایک ماہ نامہ جاری ہوا۔ جس کے ایڈیٹر خود زورؔ تھے۔ اس ادارے نے تحقیقی، تہذیبی، تاریخی، ادبی اور علمی موضوعات پر تقریباً تین سو سے زائد کتابیں شائع کیں۔ دکنی ادب پر کام کی شروعات مولوی عبدالحق نے کی تھی اور اس کو زورؔ نے عروج پر پہنچایا۔ ڈاکٹر زور نے ایک بہت بڑی لائبریری بنائی جس میں ۲۰ ہزار مطبوعات اور ڈھائی ہزار مخطوطات جمع کئے گئے۔

انہوں نے ادارۂ ادبیات اردو میں صرف لائبریری ہی نہیں قائم کی بلکہ ایک شاندار میوزیم بھی بنایا۔ اس ادارہ میں مجلس تعلیم بالغان کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا۔ ڈاکٹر زور نے ہندوستان میں تسلیم کی جانے والی زبانوں میں تحقیق کرنے والوں کے لئے ایک مہمان خانہ بھی بنایا۔ جو ان کی وفات کے بعد چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر بند کر دیا گیا۔

ڈاکٹر زورؔ کو دکنی ادب سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ سرزمین دکن سے دلی لگاؤ تھا۔ دکن کے ایک ایک ذرے سے محبت تھی۔ ڈاکٹر زورؔ تمام قدیم دکنی شعراء اور ادباء کی تخلیقات کو منظر عام پر لانا چاہتے تھے۔ انہوں نے دکنی ادب کے بیش بہا جواہرات کو نکالا جو ایک زمانہ میں لاعلمی کے غار میں دبے پڑے تھے اور بہت سے گم نام فنکاروں کو تاریکی سے باہر نکالا۔ زورؔ نے بہت سی تصنیفات چھوڑی ہیں۔ جن میں لسانیاتی، ادبی، تاریخی، تنقیدی

اور تحقیقی تصانیف اور مخطوطات کی فہارس داخل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے افسانے لکھے اور شاعری بھی کی ہے۔

ڈاکٹر زور کی ''ہندوستانی لسانیات'' اپنے موضوع پر اہم کتاب ہے۔ اس میں لسانیات سے متعلق مباحث کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں آٹھ ابواب ہیں جو لسانیات کے مقاصد، فوائد، تاریخ زبان کی ماہیت، ارتقاء اور تشکیل سے متعلق معلومات فراہم کر کے دنیا کی زبانوں کی تقسیم اور مختلف لسانی خاندانوں سے بحث پر مشتمل ہے جب کہ دوسرے حصہ میں اردو کے آغاز اور ارتقاء سے متعلق گفتگو ہے۔

انہوں نے پیرس میں ہندوستانی لسانیات سے متعلق انگریزی میں Hindustani Phonetics (ہندستانی صوتیات) لکھی جو اپنی نوعیت کی لاجواب اور اولین کتاب ہے۔ اس میں زبان کا صوتی تجزیہ کیا گیا ہے۔ محی الدین قادری زورؔ کے لسانی تحقیق کے بارے میں سیدہ جعفر رقمطراز ہیں۔

> ''ڈاکٹر زور کی ''ہندوستانی لسانیات'' اور ''ہندوستانی صوتیات'' اردو کی لسانی تحقیق میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر زور کی اولیت اس میں ہے کہ انہوں نے اس وقت لسانیات کے موضوع کی طرف توجہ کی جب اردو ہی نہیں ہندی کے علماء کو بھی اس کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا تھا'' [1]

''اردو شہ پارے'' میں ڈاکٹر زور نے اردو ادب کے آغاز سے ولی دکنی کے زمانے تک کے شعراء و ادباء کے کلام کا انتخاب کیا ہے۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں نثر اور دوسرے حصے میں نظم کا انتخاب ہے۔ مقدمے میں اردو ادب کے عہد بعہد ترقی کا جائزہ ہی پوری کتاب کی جان ہے اور اسی وجہ سے یہ کتاب تاریخ کی فہرست میں شامل کی جاتی ہے۔ اس کے بعد مضامین کا اشاریہ پھر مصنفین کا اشاریہ ہے اور آخر میں پانچ صفحات میں اہم تاریخوں کی جدول کے بعد اختتامیہ کے طور پر عمومی اشاریہ ہے۔ اردو شہ پارے کے لئے انہوں نے بہت محنت و مشقت کی۔ قادری زور نے خود اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

''جب ایک ایک قلمی نسخہ کو شروع سے آخر تک کئی کئی دفعہ پڑھنے کی ضرورت ہونے لگی اور قدامت زبان کی پیچیدگیوں اور کتابت کی غلطیوں نے پریشان کر دیا تو بار بار طبیعت چاہتی تھی کہ خیال ترک کر دوں لیکن کام کی اہمیت اور ادبی ذوق نے گوارا نہ کیا کہ اس ضروری علمی خدمت سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔'' ۲

میر عثمان علی خان آصف سابع کے عہد میں اردو ادب کی ترقی اور ان کی ادب پروری کا تفصیلی تذکرہ ''عہد عثمانی میں اردو کی ترقی'' میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی ضمن میں جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کے قیام اور ان کی خدمات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، کتاب میں چار صفحات کے دیباچہ کے بعد دس صفحات پر مشتمل تمہید ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب ہے جو کہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کے آخر میں اٹھارہ صفحے کا طویل اشاریہ ہے جو مکمل اور سہولت بخش ہے۔

ڈاکٹر زور کی کتاب ''اردو کے اسالیب بیان'' دراصل اردو نثر کی تنقیدی تاریخ ہے، زور نے مکمل نثری سرمایہ کو نو ادوار میں بانٹ کر ہر دور کی نثر نگاری پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ کتاب کے آخر میں انہوں نے اردو کے مستقبل پر ایک تفصیلی مضمون بھی لکھا ہے۔

۱۳۵۰ء سے ۱۷۵۰ء تک دکنی ادب کے قدیم مرکزوں گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، گولکنڈہ، حیدرآباد اور اورنگ آباد کے شاعروں اور ادیبوں کی چار سو سالہ خدمات کا جائزہ ''دکنی ادب کی تاریخ'' میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں چھ ابواب ہیں، ان ابواب میں دکن کے مختلف قدیم علمی و ادبی مرکزوں کے کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب سے متعلق سیدہ جعفر لکھتی ہیں۔

''ڈاکٹر زور کی یہ ادبی تاریخ مختصر ہے لیکن ہر دور کے اہم شاعروں اور ان کی تصانیف کا ذکر اس میں موجود ہے یہ ادبی تاریخ ضروری معلومات سے پر ہے لیکن اس میں کہیں کہیں انتہائی ایجاز و اختصار سے کام لیا گیا ہے۔'' ۳

۱۵۹۲ء سے لے کر ۱۹۵۱ء تک حیدرآباد کے اردو، فارسی اور عربی ادب کا جائزہ

''داستان ادب حیدرآباد'' میں لیا گیا ہے، جس میں تمام ارباب فن کا حال اور ان کے فن پر تبصرہ شامل ہے۔ ساتھ ہی حیدرآباد کی جملہ علمی و ادبی تحریکات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ایک اچھی اور جامع کتاب ہے، جو حیدرآباد کی ادبی اور علمی زندگی پر محیط ہے۔

''روح تنقید'' ڈاکٹر زور کی اہم تالیفات میں سے ایک ہے۔ اردو میں یہ فن تنقید پر اولین کتابوں میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں تنقید کے ارتقاء، ادب اور تنقید کے باہمی تعلق اور فن تنقید کے اصول و مبادی سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے حصہ میں دنیا کے مختلف ممالک (یونان، روما، فرانس اور انگلستان) میں تنقید کے ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں مصنفین اور تصنیفات سے متعلق اشاریہ ہے۔

''تنقیدی مقالات'' ڈاکٹر زور کے مقالات کا مجموعہ ہے اور یہ مجموعہ روح تنقید کے دوسرے حصہ کی حیثیت سے شائع ہوا۔ مقالات کے اس مجموعہ میں اردو اور فارسی کے مختلف موضوعات پر تحقیقی اور تنقیدی مضامین ہیں اور ان مضامین کی حیثیت علمی تنقید کی ہے۔ ڈاکٹر زورؔ خود کہتے ہیں کہ اس مجموعہ میں کئی قسم کے مضامین ہیں، بعض وہ ہیں جن پر روح تنقید کے پیش کردہ اصولوں میں سے صرف کسی ایک ہی کی روشنی میں نظر ڈالی گئی ہے۔ چند ایسے ہیں جن میں کئی اصول ملحوظ رکھے گئے۔ ایک دو ایسے ہیں جو تمام اصولوں کے تحت لکھے گئے ہیں۔ ایک انگریزی تنقید کا ترجمہ ہے اور دو تین مضامین ایسے بھی ہیں جو روح تنقید سے بہت پہلے لکھے اور شائع کئے گئے تھے۔

''ادبی تحریریں'' زورؔ کے مختلف تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جسے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مرتب کر کے شائع کیا۔ اس کتاب کی ابتداء میں گوپی چند نارنگ نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے، جس میں زور کی تنقید نگاری ان کے اسلوب نگارش اور ان کی مختلف صفات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مولوی محمد مبین عباسی چریاکوٹی کے مرتب کردہ چار جلدوں میں اردو شاعری کے

انتخاب ''جواہر سخن'' پر ڈاکٹر زورؔ نے طویل تبصرہ کیا ہے جو پہلے مجلّہ حیدرآباد عثمانیہ میں شائع ہوا۔ بعد میں اسے کتابی شکل دیدی گئی۔ اس انتخاب پر زورؔ کے بے لاگ تبصرہ نے اس کی خامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔

ڈاکٹر زور کی ایک تصنیف ''تین شاعر'' ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے میر تقی میر کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی مثنوی نگاری پر تبصرہ کیا ہے اور بحیثیت مثنوی نگاران کا مقام اور مرتبہ متعین کیا ہے۔ اس کے علاوہ کتاب کے دوسرے شاعر میر انیس کی مرثیہ نگاری سے بحث کی ہے، انیس کے مرثیوں کا مقابلہ اور موازنہ ایلیڈ، مہابھارت، رامائن، فردوسِ گمشدہ اور شیکسپیر کے مختلف ڈراموں سے کر کے انیس کے مراثی کو فوقیت دی ہے۔ کتاب کا آخری اور تیسرا شاعر ہوریس اسمتھ ہے۔ ہوریس اسمتھ انگلستان کی مشہور ادبی شخصیت کا نام ہے۔ اس کتاب میں مذکورہ شاعر کے حالات زندگی، اس کے خاندانی ماحول اور پس منظر کا جائزہ لے کر ہوریس اسمتھ کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔

ڈاکٹر زورؔ نے ''مرقع سخن'' کے نام سے دو جلدوں میں حیدرآباد کے آصفیہ دور کے ممتاز شعراء کا تذکرہ لکھا ہے۔ پہلی جلد میں پچیس اور دوسری جلد میں پچاس شعراء کا باتصویر تذکرہ ہے۔

اس کتاب میں شاہی خاندان کے علاوہ امراء، صوفیا اور دیگر عمائد کا تذکرہ اور نمونہ کلام بھی درج ہے۔ اس میں مختلف شعراء پر مختلف لوگوں سے مضامین لکھائے گئے ہیں۔ دوسری جلد میں ایک مجموعی فہرست بھی شامل کی گئی ہے، جس میں ان تمام شعراء کے نام درج ہیں جن کا ذکر مرقع سخن کی دونوں جلدوں میں مختلف ادوار کے تحت کیا گیا ہے۔

محی الدین قادری زور نے ''گلزار ابراہیم'' کو مرتب کرتے وقت اس کی ترتیب میں یہ التزام رکھا کہ گلشن ہند میں جن شاعروں کا حال تھا اس کو اردو میں علی لطف ہی کے الفاظ میں درج کیا ہے اور علی لطف کے حذف و اضافہ اور ترمیم وتبدیلی کو درست کردیا ہے اور بقیہ ۲۵۲ شاعروں کے حالات علی ابراہیم کی عبارت میں ہیں، واضح رہے کہ کتاب ۳۲۰

شاعروں کے تذکرہ کا نام ہے۔اس تذکرہ کی بناپر علی لطف نے ۱۸۰۰ء میں اپنا تذکرہ گلشن ہندلکھا جوگلزار ابراہیم سے منتخب کردہ ۶۸ شاعروں کے حال پر مشتمل ہے۔

قادری زور ایک باشعور مخطوطہ شناس ہیں۔ انہوں نے صرف مخطوطات کی فہرست سازی ہی نہیں کی بلکہ ہر مخطوطے کی توضیحات پر خصوصی توجہ دی۔

زور صاحب نے ''تذکرہ اردو مخطوطات'' پانچ جلدوں میں مختلف اوقات میں مرتب کیں۔ یہ ۱۱۵۰ مخطوطات کی وضاحتی فہرست ہے۔ کتاب کی فہرستوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ زورؔ نے صرف ان کی وضاحت ہی نہیں کی بلکہ مصنفین کے بارے میں بھی ضروری معلومات پیش کی ہیں۔ ہر ایک مخطوطہ کے بارے میں انہوں نے تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں۔ ان کے مطالعے سے زورؔ کی تحقیقی صلاحیت اور ان کے مطالعہ کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

تذکرۂ اردو مخطوطات کے بارے میں قادری زور لکھتے ہیں

''ادارے کے جملہ ۱۱۵۰ مخطوطات کے بارے میں تفصیلات (پانچ جلدوں میں) منظر عام پر آ رہی ہیں۔ابھی تقریباً چار ہزار مخطوطات ایسے ہیں جن کی ایسی ہی توضیحی فہرست مرتب اور شائع کرنی ہے اور اس تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔'' [۴۲]

انہوں نے فرانس کے مشہور مستشرق اور ہندوستان کے بہی خواہ گارساں دتاسی کی سوانح اور ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ''گارساں دتاسی اور اس کے ہم عصر بہی خواہان اردو'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ کتاب کے جس حصے میں دتاسی کی ادبی حیثیت کے بارے میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ نہایت مستند اور معتبر ہیں۔ کتاب کے دوسرے حصہ میں یورپین بہی خواہان اردو کا تذکرہ ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں پہلی کتاب ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے ''سرگزشت غالب''، ''حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ''، حیات میرؔ محمد مومن''، ''سرگذشت حاتم''، ''سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب''، اور ''نذر محمد قلی قطب شاہ'' لکھ کر اردو سوانح میں اضافہ کیا۔ ان کتابوں میں

انہوں نے مذکورہ شخصیات کی سوانح حیات کے ساتھ ان کے کلام پر تبصرہ بھی کیا ہے، اس کے علاوہ اس دور کے علوم وفنون کی ترویج وترقی وغیرہ کا تفصیلی ذکر کیا ہے، جن کے مطالعہ سے زورؔ کی تاریخی اور ادبی معلومات کی وسعت اور مطالعہ کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر زورؔ نے متعدد شاعروں و ادیبوں کے کلام کو منتخب کر کے پیش کیا ہے۔ ''کیف سخن'' ڈاکٹر زورؔ کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ یعنی انہوں نے اس میں رضی الدین حسن کیفی کے منتخب کلام کو پیش کر کے دکن کی اردو شاعری پر روشنی ڈالنے کے بعد کیفی کے حالات زندگی اور کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ ''بادۂ سخن'' ڈاکٹر احمد حسین مائل کے کلام کا انتخاب ہے، جو دکن کے بڑے پرگو اور قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ داغ، حالی، محمد حسین آزاد اور نذیر احمد کے ہم عصر تھے۔ اس مجموعہ میں مائل کی غزلوں کا انتخاب ہے۔ شروع میں دکن کی اردو شاعری پر ایک نوٹ، اس کے بعد مائل کے حالات زندگی اور ان کے کلام پر تبصرہ ہے۔

نواب عزیز جنگ بہادر عزیزؔ جو دکن کی اہم سیاسی، سماجی اور ادبی شخصیت کے مالک تھے، خود شاعر تھے اور شاعروں کی سرپرستی کرتے تھے، ان کے کلام کو زورؔ نے ''متاعِ سخن'' کے نام سے اکٹھا کیا ہے۔ اس کتاب میں دکن کی اردو شاعری پر روشنی ڈالنے کے بعد عزیز کے حالات اور ان کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر زورؔ نے ''فیض سخن'' میں ایک ایسے دکنی شاعر اور ادیب کے کلام کا انتخاب شامل کیا جو متعدد کتابوں کے مصنف اور مؤلف تھے۔ حافظ میر شمس الدین محمد فیض نے حیدرآباد کی علمی و ادبی فضا کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا۔ انہیں لغت نویسی اور فنِ عروض میں مکمل عبور حاصل تھا۔ ان کے کلام میں صوفیانہ رنگ غالب ہے۔ فیض سخن میں زور نے فیض کی زندگی کے حالات اور ان کے کلام پر عمومی تبصرہ کیا ہے۔ ساتھ ہی فیض کی صوفیانہ شاعری پر خصوصی توجہ دی ہے۔

سدانند جوگی بہاری لال رمزؔ حیدرآباد کے خوش فکر اور خوش گو شاعر تھے۔ زورؔ نے ان کے کلام کو ''رمز سخن'' کے نام سے یکجا کیا ہے۔ کتاب کی ابتداء میں دکن کی اردو شاعری کا

جائزہ ہے۔اس کے بعد رمز کے حالات زندگی اور کلام پر تبصرہ کر کے ان کے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے۔

''کلیات قلی قطب شاہ'' ڈاکٹر زورؔ کا عظیم کارنامہ ہے۔ کتاب کے شروع میں انہوں نے ایک طویل اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے۔جس میں قلی قطب شاہ کے حالات، اس عہد کے سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کے علاوہ قلی قطب شاہ کے کلام کا تسلی بخش جائزہ لیا گیا ہے۔کتاب کے آخر میں قدیم، نامانوس اور مشکل الفاظ کی فرہنگ شامل کر کے زور نے اپنے اس کارنامہ کو مزید عظمت دلا دی ہے۔

''معانی سخن'' محمد قلی قطب شاہ کے کلام کا انتخاب ہے،جس کی ابتداء میں دیباچہ عمومی میں دکن کی شاعری کی تاریخ کے بعد مقدمہ میں محمد قلی قطب شاہ کے کلام پر تبصرہ ہے۔اس کتاب میں نہوں نے ان کی نظموں، غزلوں اور دیگر اصناف کا انتخاب پیش کیا ہے۔زور نے اس انتخاب میں ایسی نظموں کا انتخاب کیا ہے جس سے شاعر کے طرز ادا اور اس کے مخصوص تصورات کی اچھے ڈھنگ سے ترجمانی ہو سکے۔

''اردو شاعری کا انتخاب'' میں ڈاکٹر زور نے ۱۰۸ شاعروں کے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے۔کتاب میں شعراء کی ترتیب زمانی اعتبار سے کی گئی ہے، کلام کے شروع میں ہر شاعر کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔

زورؔ صاحب نے سید محمد والہؔ کی مشہور ''مثنوی طالب و موہنی'' کو کتب خانہ ادارۂ ادبیات سے دستیاب کر کے شائع کیا۔ اس مثنوی کی ترتیب میں انہیں بڑی محنت کرنی پڑی۔ اس کے شروع میں انہوں نے والہؔ کے حالات زندگی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور والہ کی شاعرانہ خصوصیات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔اس کے بعد اصل متن پیش کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں فرہنگ کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ڈاکٹر زور کہتے ہیں کہ

> ''والہ بہت بڑے مصنف اور شاعر اور انشاپرداز تھے، مختلف علوم میں مہارت رکھتے تھے اور اچھے خطاط بھی تھے''۔

ڈاکٹر زورؔ نے مرزا غالب کی حیات اور کارناموں پر ایک مجمل سرگذشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب ''روح غالب'' میں پیش کیا ہے۔ کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں غالب کی سوانح، ان کی نظم و نثر کا تعارف، اعزہ، احباب اور تلامذہ کا تذکرہ ہے۔ دوسرے حصے میں ان کے خطوط سے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے شاہ حاتم کا انتخاب بھی شائع کیا ہے۔

شاد عظیم آبادی اردو کے مشہور شاعر تھے اور شاعری میں اپنا مخصوص مقام رکھتے تھے۔ شاعری کے علاوہ نثر میں بھی مخصوص اسلوب کے مالک تھے۔ ان کے مکاتیب میں ادبی شان نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے ان کے مکاتیب کو ''مکاتیب شاد عظیم آبادی'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ مکاتیب شاد عظیم آبادی کے طویل مقدمہ میں زور نے شاد عظیم آبادی کے حالات بیان کرنے کے بعد ان کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے ساتھ ہی خطوط کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

''شاد اقبال'' مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ اور علامہ اقبال کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا سب سے پہلا خط علامہ اقبال کا ہے اور آخری خط سرکشن پرشاد کا۔ کتاب کے شروع میں زورؔ نے اپنے طویل مقدمے میں پیش کئے گئے انہیں خطوط کی روشنی میں دونوں ہستیوں کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ مقدمہ بہت ہی دلچسپ اور علمی ہے۔ اس مقدمہ سے دونوں بزرگوں کی سیرت کے چند پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

انہوں نے حیدرآباد کی تاریخ پر مبنی ایک نیم تاریخی افسانہ ''طلسم تقدیر'' لکھا ہے۔ اس کے شروع میں پروفیسر عبد القادر سروری کا مقدمہ ہے، جس میں انہوں نے فن افسانہ اور افسانہ نگاری سے متعلق تفصیلی بحث کی ہے۔

زورؔ کے سولہ افسانوں کے مجموعہ ''سیر گولکنڈہ'' میں گولکنڈہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ آخر میں گولکنڈہ کے تاریخی آثار کی موجودہ صورت حال کا خاکہ اور دیباچہ میں گولکنڈہ کے حکمرانوں کی مختصر تاریخ بھی لکھی گئی ہے۔

''گولکنڈے کے ہیرے'' میں زور کے چھ افسانے شامل ہیں۔ اس کے دیباچہ میں انہوں نے ان افسانوں کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ اپنی کتاب ''فن انشا پردازی'' میں ڈاکٹر زورؔ نے انشاء پردازی اور تصنیف و تالیف میں کامیابی حاصل کرنے کے ابتدائی اصول اور عملی طریقے بتائے ہیں۔

''فرخندہ بنیاد حیدرآباد'' کو زورؔ نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ کا موضوع تاریخ ہے۔ جس میں شہر حیدرآباد کی تعمیر اور اس کی آبادی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے حصے کا عنوان داستانِ ادب حیدرآباد ہے اس میں حیدرآباد کی داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ نے اپنی مختصر سی زندگی میں بہت کام کیا ہے۔ انہوں نے موقع اور محل کے اعتبار سے جس کام کی افادیت کو سمجھا اور خود کو اس کے اہل پایا، اسے پورا کیا۔ یہ زور صاحب کی خوش نصیبی اور ان کے قلم کا اعجاز تھا کہ ان کی بیشتر کتابیں بے حد مقبول ہوئیں اور خود انہیں کی زندگی میں متعدد بار شائع ہوئیں۔

زور صاحب ہمارے ان بزرگوں، عالموں اور محققوں میں سے ایک ہیں جن کی روشن کی ہوئی شمعیں ہمارے لئے مشعلِ راہ ہیں، ان کے علمی و ادبی کارنامے ہمارے لئے علم و تحقیق کا قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔ ڈاکٹر زور اپنی ذات اور اپنے کام دونوں اعتبار سے ایک ادارہ تھے، اردو پر ان کا احسان قائم رہے گا۔

زورؔ صاحب کو ادب اور خصوصاً دکنی ادب پر زبردست ملکہ حاصل تھا۔ دکنی ادب میں ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ تحقیق اور تلاش کی ان کی دلچسپی اپنی مثال آپ تھی۔ قیام یورپ کے دوران جہاں جہاں انہیں اردو کے مخطوطات دستیاب ہوئے، ان سے استفادہ کیا۔ انہوں نے اردو کی خدمت اس وجہ سے نہیں کی کہ وہ اردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہے بلکہ اس لئے کہ اردو کی خدمت ان کے مزاج اور فطرت میں داخل تھی۔ وہ زندگی بھر اردو کی خدمت کرتے رہے۔ انہوں نے اردو ماحول میں آنکھیں کھولیں اور آنکھیں بند بھی کیں تو ایسی ریاست میں جس کی سرکاری زبان اردو تھی۔ انہوں نے ۱۹۳۱ء میں ادارۂ

ادبیات اردو قائم کر کے اپنی زندگی کا سب سے بڑا اور زبردست کارنامہ انجام دیا ہے۔ زور صاحب کی زندگی اردو کے نام پر وقف تھی۔ اردو کی ترویج و اشاعت میں تاحیات مصروف رہے اور اردو کے تعلق سے کبھی بھی مایوس نہیں ہوئے۔

زور کے تصنیفی اور تالیفی کام کو دیکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے کیونکہ جلسے، جلوس، مشاعروں، دعوتوں اور کمیٹیوں وغیرہ کے لئے پابندی سے وقت نکال کر اس میں شریک ہونے کے باوجود ان کی تصنیفی رفتار میں کبھی فرق نہیں آیا۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ رات کو سوتے تو صبح کو ان کے تکیہ کے نیچے سے ان کی ایک تصنیف نکل آتی۔

زور صاحب محقق، مؤرخ، نقاد اور مرتب کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں، ان کی تحریر بے رنگ، پھیکی، ناہموار اور سپاٹ نہیں۔ ان کی تحریروں میں شگفتگی، سلاست، روانی، زبان و بیان کا زور اور معنوی حسن پایا جاتا ہے۔ اپنی تصانیف کے سلسلے میں ان کو ہندوستان ہی میں نہیں ہندوستان کے باہر بھی سراہا گیا۔ کئی جگہوں پر ان کی کتابیں نصاب میں بھی شریک ہیں اور آج بھی ان کی کتابوں کی اہمیت کم نہ ہوئی۔

انہوں نے کم عمری ہی سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی کم سنی میں کتابیں لکھنے اور زودنویسی کی وجہ سے کتابوں میں بالغ نظری نہ ہوسکی۔ بالخصوص طالب علمی کے زمانے میں لکھی گئی کتابوں پر نقادوں کو تنقید کرنے کا موقع مل گیا۔ روح تنقید، تنقیدی مقالات اور تین شاعر کے مضامین جلد جلد تھوڑی مدت میں لکھے جانے کی وجہ سے اعلی پایہ کے نہیں ہیں۔ زورؔ نے اپنی کم سنی کے زمانہ میں جو بھی کتابیں لکھی ہیں، ان پر خواہ کتنے ہی اعتراضات کئے جائیں، پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس عمر میں کوئی دوسرا ایسی کتابیں نہیں لکھ سکتا ہے۔ انہوں نے اس زمانہ میں جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے آج بھی ان سے استفادہ کیا جار ہا ہے۔

حوالہ جات

۱؎ ڈاکٹر زور، پروفیسر سیدہ جعفر، ساہتیہ اکادمی، دوسری بار، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۳۱

۲؎ اردو شہ پارے جلد اول، محی الدین قادری زور، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد، دکن، ۱۹۲۹ء، تمہید

۳؎ ڈاکٹر زور، ص: ۶۹

۴؎ تذکرہ مخطوطات ج ۵، مرتبہ محی الدین قادری زور، ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد، ۱۹۵۹ء، ص: ۵

مولانا امتیاز علی خاں عرشی

(۱۹۰۴ء۔۱۹۸۱ء)

مولانا عرشی نے ۱۹۲۶ء میں انگریزی کا امتحان دے کر انٹرنس کی سرٹیفکٹ حاصل کی۔ عرشی تعلیم و تعلم چھوڑ کر تجارت کو ذریعۂ معاش بنانا چاہتے تھے لیکن انہوں نے اپنی تعلیم کے مطابق وہی ملازمت اختیار کی جس کی خواہش و آرزو ان کے والد کو تھی۔ دوران ملازمت تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھا اور اہل ذوق حضرات کو تحقیق و تنقید، ترتیب و تدوین اور تحشیہ نیز طباعت و اشاعت کا معیار بتا دیا۔ اردو میں تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے والے تو بہت ہیں۔ مگر وہ لوگ جن کا شمار پائے کے محققوں میں ہوتا ہے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ان میں ایک نام امتیاز علی عرشی کا بھی ہے، عرشی ایک ایسے محقق اور ناقد ہیں جو اردو، عربی اور فارسی میں مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے تینوں زبانوں میں بے شمار کام کیا ہے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

انہوں نے ندوہ کا سفیر ہونے کی حیثیت سے کچھ دن کام کیا ہے۔ مگر اس ملازمت سے ملے تلخ تجربہ کی بناء پر مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ پھر اسے ترک کر کے جملہ انہماک کے ساتھ تصنیف و تالیف میں لگ گئے۔

۱۹۳۲ء میں رامپور کے ریاستی کتب خانہ کو نظامت کے لئے ایک ایسے شخص کی

ضرورت تھی جو عربی، فارسی و انگریزی تینوں زبانیں جانتا ہو۔ عرشی نے اس اسامی کے لئے درخواست دی، ان زبانوں پر دسترس کی وجہ سے ان کا انتخاب بھی ہوگیا اور وہ ایک زمانے تک اس عہدے پر فائز رہے۔

امتیاز علی خاں عرشی صرف محقق اور ناقد ہی نہیں بلکہ ایک شاعر بھی تھے، اشعار کہنے کی صلاحیت کے ان کے اندر بچپن ہی میں پیدا ہوگئی تھی۔ دوران تعلیم کئی اشعار کہا ہے۔

اپنے ماموں مولوی احمد جان خاں کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کرتے اور مختلف شعراء کا کلام سنتے تھے۔ عرشی نے شاعری میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔ انہوں نے غزلوں کے علاوہ چند رباعیاں اور نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کے کلام کی مقدار اچھی خاصی ہے مگر وہ اپنے کلام کو چھپوانا اور مشاعروں میں سنانا پسند نہیں کرتے تھے۔ عرشی نے ایک زمانہ تک تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہے۔ وہ مکاتیب غالب اور اردو دیوان غالب جیسی زندۂ جاوید یادگاریں چھوڑ کر ۱۹۸۱ء میں اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔

سید عابد حسین ان کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ

> ''کم سے کم میرے دل میں بچپن سے یہ خیال جما ہوا تھا کہ عالم کے لئے نک چڑھا، اکل کھرا اور کٹکھنا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ جب میں عرشی صاحب سے پہلے پہل نیاز ہوا اور انہیں اپنے اس تصور کے برعکس پایا تو حیرت و مسرت کا ایسا دھچکا لگا جو مجھے اب تک یاد ہے اور ہمیشہ یاد رہے گا۔'' [۱]

عرشی ایک کشیدہ قامت، کشادہ پیشانی، ہنس مکھ، خوش وضع اور خوش قطع انسان تھے۔ خلوص و سادگی، خوش مزاجی اور خوش ذوقی، فن کی سچی لگن، کام کا سچا شوق اور ولولہ ان کی خاص صفات ہیں۔ عرشی کی زندگی کے اکثر حصے تصنیف و تالیف میں گزرے۔ وہ ستائش سے بے پروا ہو کر اس کام میں لگے۔ ان کے قلم سے بہت سی تصانیف وجود میں آئیں۔

ان کی پہلی تصنیف پنجاب یونیورسٹی کے نصاب کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ جسے ۱۹۲۸ء میں شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور نے شائع کیا۔ غالب کے ان خطوط کا مجموعہ

''مکاتیب غالب'' ہے جو نواب یوسف علی خان ناظم اور نواب کلب علی خاں کے نام لکھے گئے تھے۔ عرشی نے اس مجموعہ کو ۱۸۳ صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ لکھ کر شائع کیا۔ مقدمہ پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ غالب کے بارے میں جو کچھ معلوم ہو چکا ہے اور جو معلوم نہیں ہوسکا ہے وہ سب اس میں موجود ہے۔ عرشی جب غالب کے بارے میں کچھ لکھتے ہیں تو اپنی تحریروں میں غالب کی تحریریں بڑی آسانی سے لے آتے ہیں۔ عرشی کو غالب سے بے حد محبت تھی۔ رام پور کے دارالانشاء میں پڑے ہوئے یہ خطوط جنہیں غیر اہم سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے ان خطوط سے کچھ اہم پہلو واضح کئے ہیں۔

''کتاب الاجناس'' میں ابوعبید القاسم نے مختلف معنی والے کئی سو الفاظ جمع کیا ہے۔ امتیاز علی عرشی نے اس کتاب کو شائع کیا ہے جس میں انہوں نے الفاظ کی تصحیح کر کے بہت سے ایسے الفاظ کا اضافہ کیا ہے جو مختلف معنی والے ہیں۔

رام پور میں ایک نیم سرکاری ادارہ ''رضا اکاڈمی'' کے نام سے قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ اس ادارہ میں علمی و ادبی کام ہوں گے۔ اس ادارہ کے قواعد وضوابط پر مشتمل ایک کتابچہ ''نظام نامہ'' کے نام سے ۱۹۴۰ء میں لکھی گئی جو لطیفی پریس دہلی سے چھپ کر منظر عام پر آئی۔

عرشی نے غالب کے منتخب کلام کو ''انتخاب غالب'' کے نام سے شائع کر کے غالب پرستی کا ایک اور ثبوت دیا۔ اس کتاب میں غالب کا فارسی اور اردو کلام ہے۔ اسے انہوں نے نواب کلب علی خاں والئی رامپور کو ۱۸۶۶ء میں بھیجا تھا۔ غالب کے اردو کلام کے انتخاب کو کتاب خانہ کے ردی گھر میں ڈال دیا گیا تھا جسے عرشی نے بڑی محنت سے ڈھونڈ کر طبع کیا۔ اس میں عرشی کے لکھے گئے دیباچہ کے ہر ہر لفظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں غالب سے غیر معمولی عقیدت تھی۔

اردو زبان وادب پر عرشی کی بڑی گہری نظر تھی۔ انہوں نے سید احمد علی یکتا کی ''دستور الفصاحت'' کو مرتب کر کے اس غیر معروف مصنف کو زندۂ جاوید کر دیا۔ اس کتاب میں

صرف ونحو، عروض وقوافی، معانی وبیان اور بدائع وغیرہ پر مباحث ہیں۔ جن کا علم اردو کے ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے۔ اس کتاب میں ۱۱۷ صفحات پر مشتمل عرشی کا دیباچہ بہت ہی اہم ہے۔ اس دیباچہ میں فارسی اور اردو تذکروں سے متعلق مفید اور قیمتی معلومات پیش کی ہیں۔

عرشی کو نادر چیزیں ڈھونڈ نکالنے کا فطری ملکہ تھا۔ انہوں نے نادر چیزوں کو طبع کر کے اہل ذوق حضرات تک پہنچایا ہے۔ شاہ عالم ثانی کے اردو، فارسی اور ہندی کلام کے مجموعہ کو ''نادرات شاہی'' کے نام سے شائع کیا۔ اس کتاب کے شروع میں پیش کئے گئے دیباچہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ انہوں نے متعدد کتابوں سے شاہ عالم ثانی کے منتشر حالات کو یکجا کیا ہے۔ دیباچہ میں شاہ عالم کے شعری ذوق کے متعلق مفید معلومات کے ساتھ تیموری خاندان کی علم پروری اور علم نوازی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس دیباچہ میں شاہ عالم ثانی کے ہندی اشعار کثرت سے پیش کئے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں انہوں نے اپنے محبوب موضوع (غالبیات) پر ''فرہنگ غالب'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی، اس کتاب میں غالب ہی کے الفاظ میں فارسی، عربی، ترکی، سنسکرت، ہندی اور اردو لغات کی تحقیق اور تشریح وتعبیر ہے۔ اس کام کے لئے عرشی کو بڑی محنت کرنی پڑی۔ اس فرہنگ کو تیار کرنے میں انہوں نے اردوئے معلیٰ، ابر گہربار، پنج آہنگ، انتخاب غالب، تیغ تیز، خطوط غالب کی دیگر تخلیقات سے مدد لی۔ فرہنگ غالب کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرشی اردو اور فارسی کے قواعد اور لغات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اس دیباچہ میں فارسی قواعد اور لغات کی کتابوں کی ایک لمبی فہرست موجود ہے۔

انشاء اللہ خاں انشا کی بلا نقطہ لکھی گئی ایک مختصر کہانی کا نام ''سلک گہر'' ہے۔ جب ''سلک گہر'' کا ایک نسخہ رام پور کے کتاب خانہ میں ملا تو عرشی نے اسے شائع کر دیا۔ اس کے مقدمے میں انہوں نے انشا کی خوبیوں کو بیان کیا ہے کہ انشا اس خوش بیانی اور ظرافت سے اپنی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ سننے والے عش عش کر اٹھتے ہیں۔

ایک جرمن مستشرق ڈاکٹر انگلمن نے ''دیوان الحادرہ'' کو شائع کیا تھا۔ یہ دیوان قطبہ بن اوس نامی ایک جاہلی شاعر کا کلام ہے۔ عرشی نے مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر اس میں تصحیح کرنے کے بعد کچھ اشعار کا اضافہ کر کے طبع کیا۔

عمرو بن حبیب کے اشعار کا مجموعہ ''دیوان ابی مجحن'' ہے۔ عمرو بن حبیب کو خمریات کا بلند پایہ شاعر سمجھا گیا ہے۔ عرشی نے تمام قدیم نسخوں کو سامنے رکھ کر اسے مرتب کیا اور نئے ماخذوں سے اس میں کچھ اشعار کا اضافہ کر کے اس دیوان کو شائع کیا۔

خان آرزو کی نوادرالالفاظ میں عورتوں کے مخصوص محاوروں اور الفاظ کی فہرست ہے۔ سعادت یار خاں رنگین کے دیوان ریختی میں دس پانچ الفاظ کی کمی زیادتی کے ساتھ سارے الفاظ موجود ہیں۔ عرشی نے نوادرالالفاظ اور دیوان ریختی کی تشریحات کو سامنے رکھ کر اختلاف نسخ اور تحقیقی حواشی کے ساتھ ''محاورات بیگمات'' مرتب کیا۔

کنور پریم کشور فراقی شاہ عالم ثانی کا معاصر اور اس کے لشکر میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ مرہٹوں کی سرکوبی کے وقت فراقی شاہی لشکر کے ساتھ تھا۔ انہیں ایام میں اس نے ''وقائع عالم شاہی'' روزنامچہ لکھا۔ عرشی نے اس عہد کی تاریخ کے بیش بہا ماخذ کو مفصل مقدمہ اور حواشی کے ساتھ پیش کیا۔

''دیوان غالب'' میں غالب کے تمام اردو کلام کو تاریخی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ دیوان تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ''گنجینۂ معنی'' دوسرا حصہ ''نوائے سروش'' اور تیسرا حصہ ''یادگارنامہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مولانا عرشی اس نسخے میں مختلف اصناف شعر کی ترتیب کے سلسلے میں رقمطراز ہیں۔

> ''میں نے اپنے نسخے کے تینوں حصوں کی ترتیب نسخہ رامپور کے انداز پر رکھی ہے،
>
> دیباچہ، قطعات، مثنوی، قصائد، غزلیات، رباعیات، تقریظ
>
> بعد ازاں ہر حصے کے اصناف کو جداگانہ تاریخ وار مرتب کیا ہے اور جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے ہر ردیف کی غزلوں کو الگ حصہ قرار دے کر انہیں تاریخی حیثیت سے آگے

پیچھے رکھا ہے۔'' ۲؎

اس دیوان میں غالب کی پوری زندگی میں کہے گئے اردو اشعار ہیں۔ اس دیوان کی ترتیب میں عرشی نے جو کدو کاوش کی اور جہاں جہاں سے مواد حاصل کیا، ان کو بڑی دیدہ ریزی سے ۲۷ صفحوں کے دیباچہ میں واضح کردیا ہے۔ اس دیباچہ میں انہوں نے مفید معلومات پیش کی ہیں۔ خاص کر طرز سخن، تعریف سخن، تعریف شعر، اوصاف شعر اور عیوب شعر کے متعلق غالب کے خیالات پیش کئے ہیں۔ اس کتاب پر عرشی کو ۱۹۶۱ء میں ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا۔ ''اردو اور افغان'' مزید معلومات اور چند تشریحات کے اضافے کے ساتھ وہی مقالہ ہے جسے عرشی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے جشن کے موقع پر ۱۹۴۶ء میں ''اردو پر پشتو کا اثر'' کے عنوان سے پڑھا تھا۔ اردو کی تشکیل میں افغانستان اور پشتو کا حصہ عربی، فارسی اور ترکی سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس نظریہ کی تائید میں عرشی نے دلائل فراہم کئے ہیں اور ان دلائل کے ذریعہ انہوں نے بحث کی ہے۔

مرزا محمد حارثی دہلوی نے ''تاریخ محمدی'' میں ۱۰۱ھ سے ۱۱۶۱ھ تک کے مشاہیر کا ذکر کیا ہے۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے ۱۰۱ھ سے ۱۱۶۱ھ تک والے حصے کو روایتی اہتمام سے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا۔ اس حصہ میں ان تمام اعاظم و اکابر کا ذکر ہے جو ۱۰۱ھ اور ۱۱۶۱ھ کے بیچ رہے۔

امام سفیان ثوری کی تفسیر کی اشاعت علمی دنیا کا ناقابل فراموش کارنامہ ''تفسیر القرآن الکریم'' ہے۔ عرشی نے اس تفسیر کا سورہ بقرہ سے سورہ طور تک کا نامکمل مخطوطہ دریافت کر کے پورے اہتمام اور حواشی کے ساتھ شائع کیا۔

عہد اکبری کے ایک درباری کی لکھی ہوئی ''تاریخ اکبری'' میں عہد اکبری کے حالات موجود ہیں۔ اس کتاب کا دوسرا خطی نسخہ کیمبرج میں ہے۔ عرشی نے ان دونوں نسخوں کو سامنے رکھ کر متن تیار کرنے کے بعد حواشی کے ساتھ طبع کیا، ان تصنیفات کے علاوہ انہوں نے اردو، فارسی اور عربی زبان میں کئی اور تخلیقات پیش کی ہیں۔ عرشی کی وہ تخلیقات

جو غیر مطبوعہ ہیں، ان میں سے کچھ درج کی جاتی ہیں۔ دیوان مومن جس کی تدوین دیوان غالب کی نہج پر ہوئی۔ انتخاب ناظم، اشاریہ اودھ کیٹیلاگ، خطاطی کی تاریخ، فہرست مخطوطات اردو کتاب خانۂ رضائیہ رامپور، تاریخ بابری، نفائس المآثر، تحفۃ الہند، باغ ودور، مکاتیب غالب، مسودۂ قاطع برہان، فصل الخطاب لعمر بن الخطاب، شواہد القرآن، دیوان النمر، کتاب المقصور والممدود، رسالہ فی اختلاف الملل فی الالوہیہ والامامہ وغیرہ۔

ترتیب، تدوین اور تحقیق کے علاوہ انہوں نے ایسے مضامین و مقالات لکھے جو تحقیقی، تنقیدی اور تعارفی ہیں۔ یہ مضامین و مقالات مختلف اوقات میں معارف اعظم گڑھ، نگار لکھنؤ، نیا دور لکھنؤ، نیرنگ دہلی، اردو سہ ماہی دہلی، جامعہ دہلی، برہان دہلی، ہفتہ وار نئی روشنی دہلی، آجکل دہلی، تحریک دہلی، ہفتہ وار اردو جدید دہلی، اردوئے معلیٰ دہلی، دہلی کالج میگزین، معین الادب لوہارو، اورینٹل کالج میگزین لاہور، سالانہ روئداد ادارۂ معارف الاسلامیہ لاہور، ماہ نو کراچی، ریاض کراچی، فاران کراچی، نقوش لاہور، صحیفہ لاہور، تعلیم جدید رامپور، معیار میرٹھ، علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) اردو ادب علی گڑھ مجلّہ علوم اسلامیہ علی گڑھ، ہماری زبان علی گڑھ، معاصر پٹنہ، خاور ڈھاکا، نوائے ادب بمبئی، شاعر بمبئی اور ثقافۃ الہند وغیرہ میں طبع ہونے والے مضامین صحیح مسلم کا ایک قدیم نسخہ ہندوستان میں، خاقانی ہند علامہ آصفی نظامی رامپوری، شبلی کی دو غیر مطبوعہ تحریریں، شیخ گدائی کنبوہ، سمعانی اور اس کی کتاب الانساب، غالب کی ایک غیر معروف فارسی مثنوی، قواعد اردو کی ایک غیر معروف کتاب دستور الفصاحت، یاد پاستاں، دیوان غالب اردو کے ابتدائی نسخے، مرزا غالب کی اصلاحیں، نسخۂ حمیدیہ کی چند اغلاط، اقبال اور آرزوئے نایافت، کتاب خانۂ رامپور، اسلام میں تجارت کا درجہ، غالب کے فارسی خطوط، ایک نئی تحقیق، سودا کا ایک قصیدہ، کچھ داغ کے بارے میں، انہ میں سلیمان، انشاء کی دو نادر کتابیں، الامام الثوری و کتابہ فی التفسیر اور حول اخبار الزمان وغیرہ ہیں۔

ان کے علاوہ انہوں نے کچھ ایسے مضامین بھی لکھے ہیں جو طبع نہ ہو سکے۔ توقیف

گزاری، سرگذشت غالب، غالب پر ایک گفتگو، جو ہو ذوق یقیں پیدا، شعرائے رامپور کے چند پسندیدہ ترین اشعار، ہندو اہل قلم کی اہم تصنیفات کتاب خانہ رامپور میں، صوفیہ کے اہم تذکرے اور فارسی میں مخطوطۂ گراں ارزو نادرہ کے علاوہ انگریزی میں دو مضامین لکھے جو چھپ نہ سکے۔

امتیاز علی عرشی ایک ناقابل فراموش شخصیت کا نام ہے۔ ان کی تصانیف تخلیقی، تحقیقی، تنقیدی اور تعارفی ہیں۔ ان کے مختلف تصنیفی خدمات اہل ذوق اور اہل علم حضرات سے خراج تحسین اور داد وصول کر چکے ہیں۔ عرشی کے ذریعہ کئے گئے تحقیقی اور تنقیدی کاموں سے اردو زبان و ادب میں اضافہ ہوا۔ عرشی نے اردو، فارسی اور عربی پر یکساں قدرت رکھنے کی وجہ سے ان تینوں زبانوں میں لکھی گئی پرانی کتابوں کو تلاش کر کے نئی طرز اور نئے انداز سے شائع کیا۔ عرشی کے تمام تصنیفی کارناموں نے بالخصوص متون پر حاشیہ آرائی اور تدوین کے بلند معیار نے ان کو صف اول کے مصنفین میں لا کھڑا کیا۔

عرشی کا محبوب موضوع غالبیات ہے۔ یہ ماہر غالبیات سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے غالب پر بہت ساری کتابیں لکھی ہیں۔ مکاتیب غالب، انتخاب غالب، غالب اور فرہنگ غالب وغیرہ لکھ کر انہوں نے غالب کے متعلق ان معلومات کو پیش کیا ہے جن سے ہم نابلد تھے۔ حالی کی یادگار غالب اور محمد حسن عسکری کی ادبی خطوط غالب میں جو کمیاں رہ گئی تھیں، انہیں بڑی محنت اور لگن سے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔

عرشی کا مرتب کردہ اردو دیوان غالب ہی ان کی شہرت و عظمت کے لئے کافی ہے۔ اس دیوان نے ان کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ دیوان غالب کو انہوں نے تاریخی اعتبار سے مرتب کر کے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں غالب کے شروع میں کہے گئے اشعار ہیں۔ جبکہ دوسرے حصے میں غالب کے متداول اشعار ہیں اور یہ اشعار ان کی زندگی میں متعدد بار چھپ کر تقسیم ہو چکے ہیں۔ اس دیوان کے تیسرے حصے میں غالب کا وہ کلام ہے جو ان کے دیوان کے کسی نسخے کے حاشیے، خاتمے یا کسی خط یا کسی بیاض میں ملا یا ان کے نام

سے کسی رسالہ میں شائع ہوا ہے۔

عرشی کی تحریروں میں سادگی، شگفتگی کے ساتھ دلکشی اور تاثیر ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ان کی تحریریں مدلل اور عالمانہ ہوتی ہیں۔ عرشی کے مقدمات اور دیباچوں کی دل نشینی قابل دید ہوتی ہے۔

عرشی جب غالب پر قلم اٹھاتے ہیں تو درمیان میں غالب کے اقوال اور ان کی تحریروں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔ جس طرح غالب خطوط لکھ کر خود لطف اٹھاتے اور دوسروں کے لئے سامان انبساط مہیا کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح عرشی بھی لطف اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو لطف اٹھانے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ ان کا یہ انداز اور اسلوب اس وقت ہوتا ہے جب وہ غالب پر لکھتے ہیں۔

عرشی ایک اچھے محقق، ناقد اور مصنف کے ساتھ بااخلاق اور بامروت انسان بھی تھے۔ وہ ایک عظیم ہستی ہونے کے باوجود ہر چھوٹے بڑے سے خوش دلی سے ملتے تھے۔ خشک اور سنجیدہ کتابیں ان کی کمزوری تھیں۔ وہ خشک سے خشک، ثقیل سے ثقیل اور سنجیدہ سے سنجیدہ کتابوں کو ایسے پڑھتے تھے جیسے کہ جاسوسی ناولیں اور افسانے پڑھے جاتے ہیں۔ پھر بحث و مباحثہ اس دلچسپی سے کرتے جیسے کہ آجکل سیاست، کرکٹ اور فلموں پر دلچسپی سے باتیں کی جاتی ہیں۔ عرشی ایک محقق ہی نہیں بلکہ شاعر بھی تھے۔ تخلص عرشی اختیار کرتے تھے اور یہی تخلص ان کا علم بن چکا ہے یعنی امتیاز علی خاں عرشی۔

حوالہ جات

۱ نذر عرشی، مرتبہ مالک رام ومختار الدین احمد، مجلس نذر عرشی، نئی دہلی، ۱۹۶۵ء، ص: ۶۴

۲ دیوان غالب (نسخہ عرشی) مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۵۸ء، ص: ۷۳

مقدمہ نویسی

مقدمہ ایک ایسے تحقیقی مضمون کو کہتے ہیں جو کتاب کی تکمیل یا تدوین متن کے بعد اس کتاب یا متن سے متعلق لکھا جاتا ہے۔ کتاب یا تدوین متن کی تکمیل کے بعد مقدمہ نویسی کی جاتی ہے اور اسے کتاب میں سب سے پہلے جگہ دی جاتی ہے۔ مقدمہ میں کتاب کے متن اور مصنف کے بارے میں تفصیلات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ہر کتاب یا متن کے ساتھ ایک تحقیقی مقدمہ ضرور ہونا چاہئے۔ ہاں اس بات کا خیال رہے کہ مقدمہ بہت طویل نہ ہو۔ مقدمے میں ان تمام معلومات اور نکتے کو پیش کیا جاتا ہے جو متن اور مصنف سے متعلق ہوتے ہیں۔

مقدمہ میں خاص اور اہم باتوں کا ذکر ضرور ہونا چاہئے، جتنے نسخوں کی مدد سے متن کی تصحیح کی گئی ہے مقدمہ میں ان تمام نسخوں کا مفصل تعارف ہونا چاہئے۔ جس میں نسخوں کی کتابت کے زمانے کا تعین، کاتب کا نام، مقام کتابت، کاغذ، روشنائی، کتاب کے سائز، حواشی، صفحات، سطروں کی تعداد اور املا کی خصوصیات وغیرہ کا ذکر ضرور ہونا چاہئے۔ اگر کوئی نسخہ ناقص نامکمل یا کرم خوردہ ہے تو اس کا بھی ذکر ہونا چاہئے۔

متن کے مصنف کی مستند سوانح حیات، اس کی تصنیفات کے ذکر کے علاوہ متن کے

موضوع، اس کی اہمیت اور اگر اس موضوع پر کوئی اور کتاب لکھی گئی ہے تو اس کا بھی ذکر ہونا چاہیئے۔ اگر متن کے مصادر و ماخذ معلوم ہوں تو ان کا بھی بیان ہونا چاہیئے۔ اگر نسخے میں الحاقی کلام شامل ہے یا متن میں کہیں ترمیم و اضافہ ہوا ہے تو اس کی نشاندہی مقدمے میں ہونی چاہیئے۔ متن میں مذکور اشخاص، مقامات، کتابوں، اصطلاحات، زبانوں اور علوم وفنون کا تعارف ہونا چاہیئے، اگر قدیم متن زیر تدوین ہے تو اس کا لسانی اعتبار سے تجزیہ بھی ہونا چاہیئے۔

دوران تدوین محقق کو کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسے کئی نسخے اور مخطوطے دستیاب ہوتے ہیں۔ مقدمے میں اس بات کا ذکر ضرور ہونا چاہیئے کہ مرتب نے ترتیب متن اور تصحیح متن میں کیا طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ کس نسخے کو بنیادی نسخہ بنایا ہے اور کیوں؟، دوسرے نسخوں کو بنیادی نسخہ نہ بنانے کی وجہ کے ساتھ اختلاف متن کی صورت میں جس متن کو ترجیح دی گئی ہے اس کی وجہ کیا ہے۔ جتنے مخطوطوں کی مدد سے متن تیار ہوا ہے ان سب کا بالاختصار تعارف بھی مقدمہ میں ہونا چاہیئے۔ ان نکات کے علاوہ مزید دوسرے ضروری نکات بھی مقدمے میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔

حاشیہ نگاری

حاشیہ، حواشی اور تحشیہ ان تینوں کا تعلق متن سے ہے، اگر تحقیق اور تدوین متن کی بات کی جائے تو متن کے کسی اندراج پر قاری کے علم میں اضافہ کرنے کے لئے تبصرہ یا مزید معلومات پیش کرنے کو حاشیہ کہیں گے۔ متن سے متعلق معلومات میں اضافہ کرنے والی عبارت کو حاشیہ کہتے ہیں۔ متن کی قرأت کرتے ہوئے کئی بار بعض امور سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ مرتب متن یا مدون اپنے خصوصی علم کے سہارے حواشی میں ان معلومات کو پیش کرتا ہے جن سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔

حواشی کا استعمال ماخذ کا پتہ دینے اور متن کے متعلق معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ حواشی میں ان کتابوں کے حوالے ہوتے ہیں جن سے مصنف یا مقالہ نگار براہِ راست استفادہ کرتا ہے یا جن کتابوں کا تعلق براہِ راست موضوع سے ہوتا ہے۔ ان کتابوں سے ماخذ کا پتہ چلتا۔ اس سے قاری کو مواد کے مستند او اہم ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ حاشیہ نگاری کا ایک مقصد اپنے ماخذ کا پتہ اور اپنے بیان کو درجہ استناد دینا ہے۔ اگر متن کا قاری چاہے تو خود دیکھ کر تصدیق کرلے۔

حاشیہ سے وہ عبارت مقصود ہے جو کسی کتاب کے صفحے کے کنارے یا صفحے کے نیچے لکھی جاتی ہے اور اس میں متن پر اضافے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ حاشیہ گویا وہ شرح ہے جو کسی متن پر لکھی جاتی ہے۔ حواشی میں متن کے بیان کی وضاحت، متن کے اغلاط کی تصحیح، متن سے متعلق مزید معلومات اختلافی مسائل میں متن سے متعلق مختلف نقطۂ نظر پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر متن میں کسی دوسری زبان کے مواد کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے تو حواشی میں اصل زبان کے الفاظ دیئے جانے چاہئے۔ متن میں ذکر کئے گئے افراد، مقامات، کتب و رسائل کی وضاحت حواشی میں پیش کی جاتی ہے۔ متن میں اگر دوسرے کے اقوال و اشعار، قرآنی آیات واحادیث نبوی یا ضرب الامثال وغیرہ ہیں تو ان کی نشاندہی یعنی ان کی تخریج حواشی میں کی جانی چاہئے۔ اگر متن میں کوئی غیر موزوں شعر یا مصرع درج ہے یا متن میں مزید دوسرے اغلاط مثلاً شعرا و ادباء کے سلسلے میں کوئی صریح غلطی ہے اور اسی طرح اگر متن کے مصنف کا کوئی بیان غلط ہے یا متن میں فنی اعتبار سے کوئی خامی ہے تو اس کی نشاندہی اور تصحیح حواشی میں ضرور ہونی چاہئے۔

حواشی صفحہ کے درمیان یا صفحہ کے اطراف میں لکھے جاتے تھے۔ یہ حواشی کئی طریقے سے دیئے جاسکتے ہیں۔ متن کے بیچ قوسین میں، صفحے کے نیچے فوٹ میں، مضمون یا باب کے آخر میں، کتاب کے بالکل آخر میں اور متن کی جلد کے بعد ایک الگ جلد میں بھی حواشی دیئے جاسکتے ہیں۔

بہتر طریقہ یہ ہے کہ اسی صفحہ کے نیچے حاشیہ لکھا جائے جس صفحے پر متن ہے تا کہ قاری کو اس متن سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے زحمت نہ اٹھانی پڑے اور توجہ متن سے ہٹنے نہ پائے اگر حاشیہ مضمون یا باب یا کتاب کے آخر میں ہوتا ہے تو عام طور پر قاری اسے دیکھنے کی زحمت نہیں کرتا۔ جب حواشی قاری کے لئے لکھے جارہے ہیں تو ضروری ہے کہ قاری کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے حاشیے لکھے جائیں۔ اس طریقہ کار سے قاری کو سہولت و آسانی ہوتی ہے۔

کمپیوٹر اور کمپوزنگ کی دقتوں کی وجہ سے آج کل عام طور سے حواشی مضمون یا باب کتاب کے آخر میں لکھے جا رہے ہیں۔ اس طریقے سے کمپوزنگ اور طباعت میں سہولت ہوتی ہے۔

حواشی لکھتے وقت اس بات کا خاص خیال رہے کہ وہ مختصر اور جامع ہوں، متن ہی سے متعلق ہوں جو بات متن میں جگہ پانے کی مستحق نہ ہو اسے حاشیے میں قطعی طور سے نہ لکھا جائے۔ حاشیے میں صرف وہی باتیں لکھی جائیں جو قاری کی معلومات میں اضافہ کر سکیں۔ اپنی علمیت ثابت کرنے کے لئے خواہ مخواہ اپنا سارا علم حاشیے میں زبردستی نہیں لکھنا چاہئے۔

ضمیمہ/تعلیقات نویسی

کسی کتاب کے متن کے بعد اس اضافی حصہ کو ضمیمہ کہتے ہیں جو متن سے متعلق ہو مگر اسے متن میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ اس اضافی حصے میں متن سے متعلق مزید معلومات اور اس پر تبصرے ہوتے ہیں۔

ضروری نہیں کہ ہر کتاب میں ضمیمہ شامل کیا جائے۔ علمی و ادبی کتابوں میں کم سے کم ضمیمے ہونے چاہیے۔ مرتبہ یا تدوین شدہ متن کے ساتھ ضمیمے سے احتراز کرنا چاہیے۔ کیونکہ ترتیب متن کا اصل مقصد متن کی صحت ہے نہ کہ متن یا اس کے مصنف کے بارے میں تفصیلی گفتگو۔ متن یا اس کے مصنف سے متعلق ضروری مباحث مقدمے میں کئے جاتے ہیں۔ اس لئے ترتیب متن کے کاموں میں ضمیمے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ ہاں تحقیقی مقالوں میں ضمیمے شامل کئے جاسکتے ہیں۔ کچھ محققین ضمیمے، تعلیقات اور حواشی کو مترادفات کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

پروفیسر نذیر احمد کے مطابق "آج کل تحقیق کی اصطلاح میں تعلیقات و حواشی وہ یاد داشتیں ہیں جو بہ طور ضمیمہ کتاب درج کئے جاتے ہیں۔ ان مندرجات کے امور تاریخی، ادبی، لغوی، فرہنگی ہوتے ہیں اور اصل متن کتاب میں بعض ایسے امور مذکور ہوتے ہیں جن

کی توضیحات سے کتاب کی اہمیت و افادیت میں بڑا اضافہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات عدم توضیحات کی بنا پر اصل مفہوم تک رسائی نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر جدید تحقیق میں تعلیقات نگاری وحواشی نویسی تنقید متن کا لازمہ سمجھی جاتی ہے۔''

متن اور اس کے مصنف کے بارے میں مفصل اور محقق معلومات حاصل کرنے کے لیے تعلیقات نویسی کی جاتی ہے۔ تعلیقات سے کتاب کی تفہیم وتنقید میں مدد ملتی ہے اور کتاب کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ تعلیقات نویسی ایک مشکل کام ہے۔ اس کے لئے وسیع مطالعے اور علوم وفنون پر غیر معمولی دسترس کی ضرورت ہوتی ہے۔ تعلیقات میں جملوں اور عبارتوں کی وضاحت، شخصیات ومقامات اور غیر معروف تلمیحات وغیرہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ قاری یا محقق کی توجہ متن سے ہٹنے نہ پائے اس لئے تعلیقات کو ضمیمے کی شکل میں کتاب کے آخر میں رکھتے ہیں۔

فرہنگ سازی

فرہنگ لغت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ فرہنگ سازی عام طور سے تخلیقی متن کی ہوتی ہے۔ کتاب یا متن میں شامل اصطلاحات، مشکل الفاظ ومحاورات، غریب وغیر معمولی الفاظ اور متروک وغیر معروف الفاظ کی تشریح یا عربی فقرے، جملے اور مصرعے وغیرہ کے معانی فرہنگ کے عنوان سے کتاب کے آخر میں دیئے جاتے ہیں۔ فرہنگ میں شامل تمام اندراجات الف بائی ترتیب سے دیئے جاتے ہیں۔

فرہنگ سازی میں چند امور کا خیال رکھنا چاہئے۔ ان تمام مشکل، غریب اور غیر مانوس الفاظ کو فرہنگ میں شامل کرنا چاہئے جو متن میں آئے ہیں۔ فرہنگ میں لفظ کے صرف وہی معانی بیان کرنے چاہئے جو متن میں مقصود ہیں۔ لفظوں کی فرہنگ میں ان کا وہی تلفظ دینا چاہئے جو متن میں استعمال ہوا ہے۔ جن محاورات اور ضرب الامثال کو مصنف نے عام مفہوم سے ہٹ کر استعمال کئے ہیں۔ انہیں فرہنگ میں ضرور شامل کیا جانا چاہئے۔

اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ لغات نگاری اور فرہنگ سازی میں فرق ہے۔ فرہنگ ایک خاص متن سے متعلق خاص لغت ہوتی ہے۔ فرہنگ میں لفظ کے صرف وہی معانی دیئے جاتے ہیں جو متن میں مراد ہیں جب کہ لغت میں لفظ کے جتنے بھی معنی ہوتے

ہیں سارے دیئے جاتے ہیں۔

لغت مفرد الفاظ کی تیار کی جاتی ہے۔ محاوروں اور کہاوتوں کی لغت نگاری نہیں کی جاتی۔ کسی کتاب یا متن کی فرہنگ سازی میں مفرد و مرکب یا محاوروں اور کہاوتوں کی کوئی قید نہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ متن کی فرہنگ میں صرف معنی مراد دیے جاتے ہیں۔

کتابیات سازی

مصنف و مقالہ نگار یا مرتب نے کتاب یا مقالہ کی تکمیل یا ترتیب و تدوین متن میں جن کتابوں، مسودوں اور رسائل و جرائد وغیرہ سے استفادہ کیا ہے ان کی فہرست کتاب، مقالہ یا مرتبہ متن کے آخر میں دینا کتابیات سازی ہے۔

تحقیقی کتابوں اور مقالوں کے کتابیات میں صرف ان کتابوں اور مضامین کو شامل کرنا چاہئے جن کا حوالہ متن یا فٹ نوٹ میں ہے۔ کتابیات سے ایک ہی جھلک میں مواد اور تحقیقی کام کے استناد، اہمیت اور افادیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ کتابیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف یا مرتب نے کتاب یا کام کی تیاری میں کن کن ماخذ سے مدد لی ہے۔ وہ ماخذ بنیادی ہو یا ثانوی۔ موضوع سے براہِ راست متعلق کتابیں بنیادی ماخذ میں شامل ہوتی ہیں یا وہ کتابیں شامل ہوتی ہیں جن سے کتاب کی تکمیل میں براہِ راست استفادہ کیا گیا ہے۔ جن کتابوں سے براہِ راست استفادہ نہیں کیا گیا ہے وہ ثانوی ماخذ کے ضمن میں آتی ہیں۔ دراصل ثانوی ماخذ میں معاون کتابیں شامل ہوتی ہیں یعنی وہ کتابیں جن کے حوالے کسی اور کتاب کے حوالے سے پیش کئے گئے ہیں یا وہ کتابیں جن میں سے بعض سے مصنف نے خود استفادہ کیا اور بعض کو قاری کے مطالعے کے لئے تجویز کیا ہے۔

اگر ماخذ کی فہرست میں مخطوطات، مطبوعات، مقالات ومقدمات اور رسائل و جرائد وغیرہ ہیں تو بہتر یہ ہے کہ کتابیات کی فہرست میں بالترتیب مخطوطات، مطبوعات، مقالات و مقدمات، رسائل و جرائد، ذاتی خطوط، سوالنامے اور جس زبان میں کتاب لکھی گئی ہے اس کے علاوہ دیگر زبان کی کتابوں کو رکھا جائے۔

اگر کتابیات کی فہرست طویل نہیں ہے تو کوئی ضروری نہیں کہ اسے مختلف حصوں میں تقسیم کیا جائے ہاں اگر فہرست طویل ہے اور کتابیں مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں اور مختلف زبانوں میں ہیں تو قاری اور محقق کی سہولت کے لئے کتابوں کو موضوعات اور زبانوں کے لحاظ سے تقسیم کر دینا زیادہ بہتر ہوگا۔

مخطوطات ومطبوعات کی فہرست مصنف کی الف بائی ترتیب، یعنی حروف تہجی کے لحاظ سے تیار کرنی چاہئے اور ان کے بارے میں چند اطلاعات بھی پیش کرنے چاہئے۔ مثال کے طور پر مخطوطہ اگر کسی لائبریری میں ہے تو کتابیات میں مخطوطہ کے ساتھ لائبریری کا نام اور پتہ بھی دینا چاہئے۔ اسی طرح اگر مخطوطہ کسی کی ذاتی ملکیت ہے تو اس کا بھی بالاختصار تعارف کرانا چاہئے۔

مطبوعہ کتابوں کی فہرست سازی میں مصنف یا مرتب کا نام، کتاب کا نام، ناشر یا مطبع کا نام، مقام اشاعت اور سال اشاعت ضرور دینا چاہئے۔ اس کے علاوہ کتابیات میں پہلے مخطوطہ یا کتاب کا نام اس کے بعد مصنف یا مرتب کا نام پھر ناشر یا مطبع، مقام اشاعت اور سال اشاعت بھی دے سکتے ہیں۔ کتابیات میں فہرست کتاب مصنفین کے ناموں کے ساتھ حروف تہجی کی ترتیب سے دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ فہرست کتب کتابوں کے ناموں کے ساتھ حروف تہجی کی ترتیب سے بھی دے سکتے ہیں۔ دور حاضر میں عام طور پر اسی نہج پر کتابوں کی فہرست تیار کی جارہی ہے۔ یعنی کتاب کا نام (باعتبار حروف تہجی)، مصنف رمرتب، ناشر یا مطبع، مقام اشاعت اور سال اشاعت درج کیا جائے گا ہے۔

اشاریہ سازی

علمی اور تحقیقی کتابوں کے آخر میں ان ناموں کے صفحات کی نشاندہی کرنا جو نام کتاب کے اندر آئے ہیں۔ اشاریہ کا مقصد یہ نہیں کہ کتاب کے اندر جن اشخاص، مقامات، کتب و رسائل، زبانوں اور علوم وفنون کے نام آئے ہیں۔ ان کو گنایا جائے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان سے متعلق کتاب میں جو بھی معلومات پیش کی گئی ہیں اشاریے کو دیکھتے ہی محقق اس سے واقف ہو جائے۔ اشاریے کی مدد سے قاری یا محقق کی رہنمائی ہوتی ہے اور اس کا بہت سارا وقت بھی بچتا ہے۔

اشاریہ سازی کتاب کی تکمیل کے بعد کی جاتی ہے۔ کتاب کے متن کے مطابق ہی اشاریہ ہونا چاہئے۔ کتاب میں جن چیزوں کا ذکر بار بار یا زیادہ ہوا ہے انہیں کا اشاریہ بنانا چاہئے۔ اشارئے میں ان ناموں اور عنوانات کا ذکر کرنا چاہئے جن سے قاری، محقق یا ناقد کو مدد مل سکے۔ ان کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے اشاریے کو مختصر رکھنا چاہئے تاکہ انہیں ضروری چیزوں کو تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہ ہو۔

اشاریہ سازی کتاب یا متن میں آنے والے تمام ناموں کی الف بائی ترتیب سے کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان ناموں کو کئی حصوں (شخصیات، کتب و رسائل، مقامات،

ادبی اصناف وموضوعات وغیرہ) میں علیحدہ علیحدہ تقسیم کر کے اشاریہ تیار کر سکتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اشاریہ سازی خود مصنف یا مرتب کرے۔ فہرست عناوین اور کتابیات کے علاوہ پوری کتاب کا اشاریہ تیار کرنا چاہیے۔ ترتیب و تدوین متن کے اشاریے میں متن کے ساتھ مقدمہ اور حواشی کو بھی شامل کرنا چاہیے کیونکہ مقدمے اور حواشی میں عالمانہ معلومات و مباحث ہوتے ہیں۔

کتابیات

۱- آب حیات کا تنقیدی مطالعہ، مسعود حسن رضوی ادیب، کتاب نگر دین دیال روڈ، لکھنو، بار دوم، ۱۹۶۴ء

۲- آثار الصنادید، سر سید احمد خاں، سینٹرل بک ڈپو، اردو بازار جامع مسجد، دہلی، چوتھا ایڈیشن ۱۹۶۵ء

۳- آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق، مرتبہ تنویر احمد علوی، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۱ء

۴- ادب کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر سلام سندیلوی، چوتھا ایڈیشن

۵- ادبی تحقیق، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴ء

۶- ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، رشید حسن خاں، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء

۸- ادبی ولسانی تحقیق اصول اور طریق کار، مرتبہ عبدالستار دلوی، شعبۂ اردو، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی، باراول، ۱۹۸۴ء

۹- اردو ڈرامہ اور اسٹیج، مسعود حسن رضوی ادیب، کتاب نگر دین دیال روڈ، لکھنؤ، ۱۹۵۷ء

۱۰- اردو شہ پارے جلد اول، محی الدین قادری زور، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد، دکن، ۱۹۲۹ء

۱۱- اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست، نصیر الدین ہاشمی، مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد، دکن، بار اول ۱۹۵۷ء

۱۲- اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۳ء

۱۳- اردو کی ادبی تحقیق و تنقید میں خواتین کا حصہ، ڈاکٹر عظمیٰ فرمان، کراچی یونیورسٹی پریس، کراچی، بار اول ۲۰۰۰ء

۱۴- اردو مخطوطات کتب خانہ آصفیہ، جلد ا، نصیر الدین ہاشمی، مطبع ابراہیمیہ، حیدرآباد، دکن، ۱۹۶۱ء

۱۵- اردو میں تحقیق مشمولہ ''رہبر تحقیق'' مرتبہ سید شبیہ الحسن، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء

۱۶- اردو میں سوانح نگاری، ڈاکٹر سید شاہ علی، انجمن پریس، کراچی، ۱۹۶۱ء

۱۷- اصول تحقیق و ترتیب متن، تنویر احمد علوی، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی، ۱۹۷۷ء

۱۸- الطاف حسین حالی، ہماری زبان، ۱۶ر جون، ۱۹۴۹ء، بحوالہ حالی کی اردو نثر نگاری

۱۹- الفاروق، مولانا شبلی، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۵۶ء

۲۰- انتخاب مکاتیب سرسید، شبلی اور اقبال، مرتبہ شیخ عطاء اللہ، شیخ محمد نصیر الدین ہمایوں قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ، لاہور، ۱۹۵۸ء

۲۱- پرتھی راج راسا، مرتبہ حافظ محمود خاں شیرانی، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، ۱۹۴۳ء

۲۲- پنجاب میں اردو، حافظ محمود خاں شیرانی، مکتبہ کلیاں بشیرت گنج، لکھنو، ۱۹۶۰ء

۲۳- تاریخ ادب اردو، جلد سوم، سیدہ جعفر، وی۔ جی۔ پرنٹرس، دلسکھ نگر، حیدرآباد، ۲۰۰۲ء

۲۴- تاریخ فیروز شاہی مشمولہ مقالات سرسید احمد خاں، مرتبہ محمد عبداللہ خاں خویشگی، نیشنل پرنٹرس کمپنی علی گڈھ، ۱۹۵۲ء

۲۵- تحقیقات، عندلیب شادانی، قومی کتب خانہ جلیل اکیڈمی، بریلی، ۱۳۵۰ھ

۲۶- تحقیق کا فن، پروفیسر گیان چند جین، مقدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء

۲۷- تحقیق کی روشنی میں، عندلیب شادانی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۳ء
۲۸- تحقیق نامہ، مشفق خواجہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۱ء
۲۹- تحقیقی مطالعے، نذیر احمد، دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ، بار اول ۱۹۵۴ء
۳۰- تدوین متن کے مسائل، مرتبہ قاضی عبدالودود، ۱۹۸۱ء
۳۱- تذکرہ مخطوطات ج ۵، مرتبہ محی الدین قادری زور، ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد، ۱۹۵۹ء
۳۲- تنقید شعر العجم، حافظ محمود شیرانی، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، ۱۹۴۲ء
۳۳- حافظ محمود شیرانی، مرتبہ کلیم الدین احمد، بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ، ۱۹۸۲ء
۳۴- حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات (جلد اول)، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ناظم مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۹۳ء
۳۵- حافظ محمود شیرانی تحقیقی مطالعے، مرتبہ پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، دسمبر 1991ء
۳۶- حالی کی اردو نثر نگاری، ڈاکٹر عبدالقیوم، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۶۴ء
۳۷- حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، اکادمی پنجاب (ٹرسٹ)، لاہور، ۱۹۷۶ء
۳۸- خالق باری، مرتبہ حافظ محمود شیرانی، انجمن اردو (ہند) دہلی، بار اول ۱۹۴۴ء
۳۹- خطوط شبلی، مرتبہ مولوی محمد امین صاحب، تاج کمپنی لمیٹیڈ، لاہور، ۱۹۳۵ء
۴۰- دار المصنفین کی تاریخی خدمات، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۲ء
۴۱- دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی، انشا پریس، لاہور، ۱۹۶۰ء
۴۲- دیوان ذوق، مرتبہ مولوی محمد حسین آزاد، علیمی پرنٹنگ ورکس، دہلی، ۱۹۳۳ء
۴۳- دیوان غالب، مرتبہ مالک رام، آزاد کتاب گھر، ۱۹۵۷ء
۴۴- دیوان غالب (نسخہ عرشی)، مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڈھ،

۱۹۵۸ء

۴۵- دیوان غالب، مرتبہ مولانا غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۶

۴۶- ڈاکٹر زور، پروفیسر سیدہ جعفر، ساہتیہ اکادمی، دوسری بار، ۱۹۹۰ء

۴۷- ڈاکٹر عندلیب شادانی ایک مطالعہ، نظیر صدیقی، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۵ء

۴۸- روح انیس، مسعود حسن رضوی ادیب، انڈین پریس، الہ آباد، طبع اول، ۱۹۳۱ء

۴۹- سرسید کی نثری خدمات، ڈاکٹر مشتاق احمد، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۳ء

۵۰- سید احمد شہید، غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۴ء

۵۱- سید مسعود حسن رضوی ادیب، انیس اشفاق، ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۵ء

۵۲- سیرۃ النبی حصہ اول، مولانا شبلی نعمانی، معارف پریس، اعظم گڑھ، طبع ششم

۵۳- عیارستان، قاضی عبدالودود، ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ، ۱۹۵۷ء

۵۴- غالب نامہ (قاضی عبدالودود نمبر) دہلی، ۱۹۸۷ء

۵۵- فائز دہلوی اور دیوان فائز، مرتبہ مسعود حسن رضوی، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۶۵ء

۵۶- فردوسی پر چار مقالے، حافظ محمود شیرانی، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، ۱۹۴۲ء

۵۷- فیض میر، مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب، نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ، لکھنو، بار دوم، ۱۹۶۴ء

۵۸- قاضی عبدالودود تنقیدی و تحقیقی جائزے، مرتبہ پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء

۵۹- قاضی عبدالودود کی علمی وادبی خدمات، ڈاکٹر محمد نورالاسلام (علیگ)، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۰۰ء

۶۰- قاطع برہان ورسائل متعلقہ، مرتبہ قاضی عبدالودود، ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ، ۱۹۶۷ء

۶۱- قطب مشتری، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۳۸

۶۲- قواعد اردو، مولوی عبدالحق، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۵۸ء

۶۳- کلیات مکاتیب اقبال، جلد دوم، سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۱ء
۶۴- مبادیات تحقیق، عبدالرزاق قریشی، ادبی پبلشرز، ۸- شیفرڈ روڈ، بمبئی، ۱۹۶۸ء
۶۵- متنی تنقید، خلیق انجم، الجمعیہ پریس، دہلی، ۱۹۶۷ء
۶۶- محمد حسین آزاد کی تنقید نگاری، قاضی محمد خالد اقبال صدیقی، بھوپال بک ہاؤس، بھوپال، ۱۹۸۹ء
۶۷- محی الدین قادری زور، مرتبہ خلیق انجم، انجمن ترقی (ہند) دہلی، ۱۹۸۹ء
۶۸- مسعود حسن رضوی ادیب حیات اور کارنامے، ڈاکٹر طاہر تونسوی، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء
۶۹- مسعود حسن رضوی ادیب، ذات وصفات، مرتبہ مالک رام
۷۰- مطالعہ حالی، شجاعت علی سندیلوی وناظر کاکوروی، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۵۶ء
۷۱- معارف، اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۲۹ء
۷۲- معاصر (قاضی عبدالودود نمبر) پٹنہ، اگست، ۱۹۷۶ء
۷۳- مقالات حافظ محمود شیرانی جلد سوم، مرتبہ مظہر محمود شیرانی، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۶۹ء
۷۴- مقالات حافظ محمود شیرانی جلد پنجم، مرتبہ مظہر محمود شیرانی، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۷۰ء
۷۵- مقالات سرسید ہفتم، سرسید احمد خاں، مجلس ترقی ادب کلب روڈ، لاہور، ۱۸۷۸ء
۷۶- مقالات سرسید، پانزدہم، مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب کلب روڈ، لاہور
۷۷- مقالات شبلی، دوم، مولانا شبلی نعمانی، معارف اعظم گڈھ، ۱۹۵۰ء
۷۸- مقدمات عبدالحق، مولوی عبدالحق، اردو مرکز لاہور، ۱۹۶۴ء
۷۹- مقدمہ شعر وشاعری، مولانا الطاف حسین حالی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء
۸۰- موازنہ انیس ودبیر، شبلی نعمانی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۴۹ء
۸۱- مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، ۲۰۰۱ء

۸۲- مولوی عبدالحق ادبی ولسانی خدمات (ج۔۱)، خلیق انجم، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۹۲ء

۸۳- نئی تنقید، جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، باردوم، ۱۹۹۴ء

۸۴- نذر عرشی، مرتبہ مالک رام ومختار الدین احمد، مجلس نذر عرشی، نئی دہلی، ۱۹۶۵ء

۸۵- ہماری شاعری، مسعود حسن رضوی، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، دکن، ۱۹۷۱ء

۸۶- یادایام، محمد عبدالرزاق کانپوری، عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد، دکن

ہندی وانگریزی کتب

۱- نوین شودھ وگیان، ڈاکٹر تلک سنگھ، پرکاش سنستھان، دلی، ۱۹۸۲ء

۲- شودھ پرورِدھی اور پرکریا، ڈاکٹر چندر بھان راوت اور ڈاکٹر رام کمار کھنڈیل وال جواہر پستکالیہ، متھرا، ۱۹۷۹ء

۳- he Practical stylist, sheridan Beker's Thomas y Cromwell Co. New York 1977

۴- he Art of Literary Research, Richard D. Altick, Norton & Co. New York, 1967.

۵- ıtroduction to Educational Research, Corter V. Good, Meredith Publishing Company, New York. 1963

ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی کی مطبوعات

تحقیق و تنقید

ابوالکلام آزاد — شورش کاشمیری — 450/-

اجڑا دیار — شاہد احمد دہلوی — 225/-

احسن القصص (مکمل 4 جلدیں) عبدالصمد — 200/-

ادب کے میخانے کے پیر مغاں: نارنگ ساقی

نذیر فتح پوری — 400/-

اردو ادب کی تاریخ (ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری — 750/-

اردو ادب کی مختصر تاریخ — انور سدید — 495/-

اردو ادب میں سفرنامہ — انور سدید — 550/-

اردو کے مزاحیہ افسانے — ڈاکٹر مظہر احمد — 220/-

اردو کے منتخب رپورتاژ — ڈاکٹر طلعت گل — 280/-

*اردو میں سیاسی نظموں کی ادبی قدر و قیمت

پرویز احمد اعظمی — 300/-

*اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت — عابد حسین — 400/-

اردو ہندوستان — فاروق ارگلی — 495/-

اردو ہے جس کا نام — فاروق ارگلی — 600/-

ارمغانِ ادب — امتیاز احمد/عطیہ رئیس — 100/-

اسلام میں آزادی کا تصور — ابوالکلام آزاد — 150/-

اشکِ امرتسری — معصوم شرقی — 400/-

امیر خسرو عہد، فن اور شخصیت — عرش ملسیانی — 120/-

انشائیہ کے فنی سروکار — ڈاکٹر احمد امتیاز — 250/-

آزادی کے بعد اردو شاعری کے ارتقاء میں

غیر مسلم شعراء کا حصہ — ڈاکٹر ای اے حیدری — 500/-

آزادی کے بعد اردو شاعری میں طنز و مزاح

ڈاکٹر مظہر احمد — 250/-

آزادی سے قبل اردو تحقیق — ڈاکٹر محمد اکمل — 200/-

آوازِ دوست — مختار مسعود — 200/-

بہادر شاہ ظفر کی دلی — سید ضمیر حسن دہلوی — 250/-

پرچھائیوں کے اجالے — حمیدہ سالم — 200/-

پریس کی آزادی اور صحافیوں کے لیے ضابطہ اخلاق

خواجہ عبدالمنتقم — 120/-

پس تصویر (تنقیدی مضامین) راشد عزیز — 200/-

پنجابی اردو بول چال — عبدالصمد — 60/-

پیغمبرانِ حق — ڈاکٹر عقیل ہاشمی — 150/-

تاریخ نسواں — عبدالعزیز ہاشمی — 450/-

تاریخ یوسفی المعروف بہ عجائباتِ فرنگ

ڈاکٹر مظہر احمد — 400/-

تخلیق کار قمر رئیس — علی احمد فاطمی — 200/-

تصوف اور خواتین اولیائے دہلی حفظ الرحمٰن — 75/-

تفہیم شبلی — ڈاکٹر ارشاد نیازی — 400/-

تلمیحات — مظہر احمد/نجمہ رحمانی — 140/-

تمدن ہند — سید علی بلگرامی — 500/-

تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو (اول) لطف الرحمٰن — 300/-

تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو (دوم) لطف الرحمٰن — 300/-

تنقید و تخلیق — لطف الرحمٰن — 200/-

تنقیدی اظہارات — ڈاکٹر صدیق محی الدین — 180/-

تہنیت النساء تہنیت: شخصیت اور نعت گوئی

ڈاکٹر عرشیہ جبیں — 200/-

تھیٹر، پارسی تھیٹر اور آغا حشر کاشمیری انیس اعظمی — 300/-

جام جم (فارسی) — سر سید احمد خاں — 300/-

*جدید اردو غزل — ڈاکٹر راحت بدر — 250/-

جدید غزل کی علامتیں — ڈاکٹر نجمہ رحمانی — 200/-

چاندنی بیگم: ایک جائزہ — انوار الحق — 125/-

حافظ اور اقبال — شیریں زباں خانم — 200/-

حضرت محمدؐ اور انسانی حقوق — خواجہ عبدالمنتقم — 40/-

خورشید کا سامانِ سفر — شمس الرحمٰن فاروقی — 150/-

خوش کلامیاں قلم کاروں کی — نارنگ ساقی — 200/-

دفتری طریق کار — منیر انجم — 75/-

رثائیات تجزیات شخصیات عابد حسین حیدری — 225/-

رشید احمد صدیقی بحیثیت خاکہ نگار احمد امتیاز 150/-

رشید احمد صدیقی کے فکری مناسبات احمد امتیاز 80/-

رفیع الدین ہاشمی: حیات اور علمی خدمات

ڈاکٹر ظہور احمد مخدومی 250

رومی (مثنوی روم کا مطالعہ) میر ولی اللہ 200/-

روحِ ادب برائے ایم اے 300/-

زاویے (فراق کی نادر تحریریں) عبدالعزیز 125/-

سرسید بحیثیت صحافی طٰہٰ نسیم 100/-

شمس الرحمٰن فاروقی کی افسانہ نگاری کا جائزہ

طاہرہ نورانی 80/-

صحافتی زبان مسکین علی حجازی 160/-

صورت و معنیٔ سخن شمس الرحمٰن فاروقی 280/-

عبدالحسین زرین کوب ڈاکٹر مہتاب جہاں 200/-

علی جواد زیدی: شخص و شاعر عابد حسین حیدری 150/-

غالب اور آج کا شعور ڈاکٹر محمد علی صدیقی 140/-

غربت اور ناانصافی پروفیسر طاہر محمود 150/-

غیر افسانوی اردو نثر ڈاکٹر عطیہ رئیس 200/-

فارسی اردو جدید فیروز اللغات 600/-

فاروق ارگلی: اپنی تحریروں کے آئینہ میں

محمد فیروز دہلوی 300/-

فراست نامہ (فارسی) ڈاکٹر مہتاب جہاں 98/-

فرہنگ تلمیحات ثوبان سعید 300/-

فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ ضمیر حسن دہلوی 80/-

فکری زاویے ڈاکٹر عرشیہ جبیں 200/-

فنونِ لطیفہ اور تخلیقی تخیل لطف الرحمٰن 200/-

فیض احمد فیض (خصوصی مطالعہ) شفیق اشرفی 200/-

فیض احمد فیض (درد اور درماں کا شاعر)

محمد علی صدیقی 150/-

قصۂ درد سناتے ہیں پروفیسر طاہر محمود 500/-

قوانین تحفظ صارفین خواجہ عبدالمنتقم 300/-

کارِ فرصت (خطوط) ریاض عمر 250/-

لوحِ ایام مختار مسعود 450/-

مثنویات میر کا تنقیدی مطالعہ صدیق محی الدین 280/-

مجتبیٰ حسین کا فن: جمالیاتی مظاہر کیل الرحمٰن 60/-

مولانا ابوالکلام آزاد کے منتخب اداریے

محبوب فرید 200/-

مہاراشٹرا کی مختصر تاریخ پرویز عالم 200/-

میر شناسی کے دو سو سال شفیق احمد اشرفی 200/-

میزانِ تحقیق ڈاکٹر محمد اکمل 100/-

نگارِ حقائق مظفر انصاری 250/-

نیا ادبی شعور: آغاز و اسباب فصی الدین احمد 100/-

ہم وحشت میں دیتے ہیں اذاں طاہر محمود 400/-

ہندو مسلم اتحاد اور مسلم سماج خواجہ عبدالمنتقم 200/-

ہندوستان میں جدید اردو مرثیے کا ارتقاء

ای اے حیدری 500/-

ہندوستانی مسلم خواتین کی علمی خدمات

ڈاکٹر ناہید ظفر 500/-

ناول افسانے

امیر خسرو (میوزیکل اوپیرا) فصیح اکمل 100/-

آدمی نامہ (مزاح) مجتبیٰ حسین 80/-

جاپان چلو جاپان چلو مجتبیٰ حسین 80/-

دل کی آواز (افسانے) ایم پرویز 100/-

دھوپ سنوارے (افسانے) سلیم سرفراز 200/-

سن ستاون کا قصہ: عزیزن (ڈراما) تریپوراری شرما

/ترجمہ: مظہر احمد 100/-

سو ہے وہ بھی آدمی (مزاح) مجتبیٰ حسین 80/-

عمارت ڈاکٹر نگار عظیم 100/-

غبارِ خاکی (مزاحیہ) سبط اختر 125/-

گھٹتا بڑھتا پانی (افسانے) طلعت گل 80/-

محبت کا خراج (افسانے) زرین خان 60/-

منٹو کے بہترین افسانے عبدالصمد دہلوی 250/-

ہتوپدیش (کہانیاں) ڈاکٹر ارشاد نیازی 120/-

ڈاکٹر محمد اکمل شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے تربیت یافتہ ہیں۔ اس شعبے میں بحیثیت ریسرچ ایسوسی ایٹ بھی رہ چکے ہیں۔ آج کل NIOS سے وابستہ ہیں۔ اردو تحقیق و تنقید سے ان کی گہری دلچسپی ہے۔ اس لیے ان کے بیشتر مضامین تحقیقی ہوتے ہیں۔ 'میزانِ تحقیق' جو کہ ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے وہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ 'آزادی سے قبل اردو تحقیق' میں بھی انھوں نے تحقیقی طریقۂ کار کو ہی اپنایا ہے۔ اس کتاب میں تحقیق کے اصول و نظریات پر ایک مبسوط مقالہ شامل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تحقیق کی روایت پر بھی ایک مضمون شامل ہے۔ حاصل کتاب کے طور پر اس میں اردو کے نامور محققین پر عالمانہ مضامین شامل کیے گئے ہیں جو طلبا اور اساتذہ دونوں کے لیے مفید ہیں۔ کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ بھی درج کیا گیا ہے۔ جس میں تحقیقی اصطلاحات پر خیالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ کتاب بے حد اہم اور دلچسپ ہے۔

(ادارہ)

M. R. Publications

Printers, Publishers, Suppliers & Distributors of Literary Books

\# 10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002
Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com